ماهنامه

آنکھ مچولی

اپریل ۱۹۹۱ء

کراچی

اس شمارے کے ساتھ
خوبصورت عید کارڈ
کا تحفہ مفت قبول کیجیے

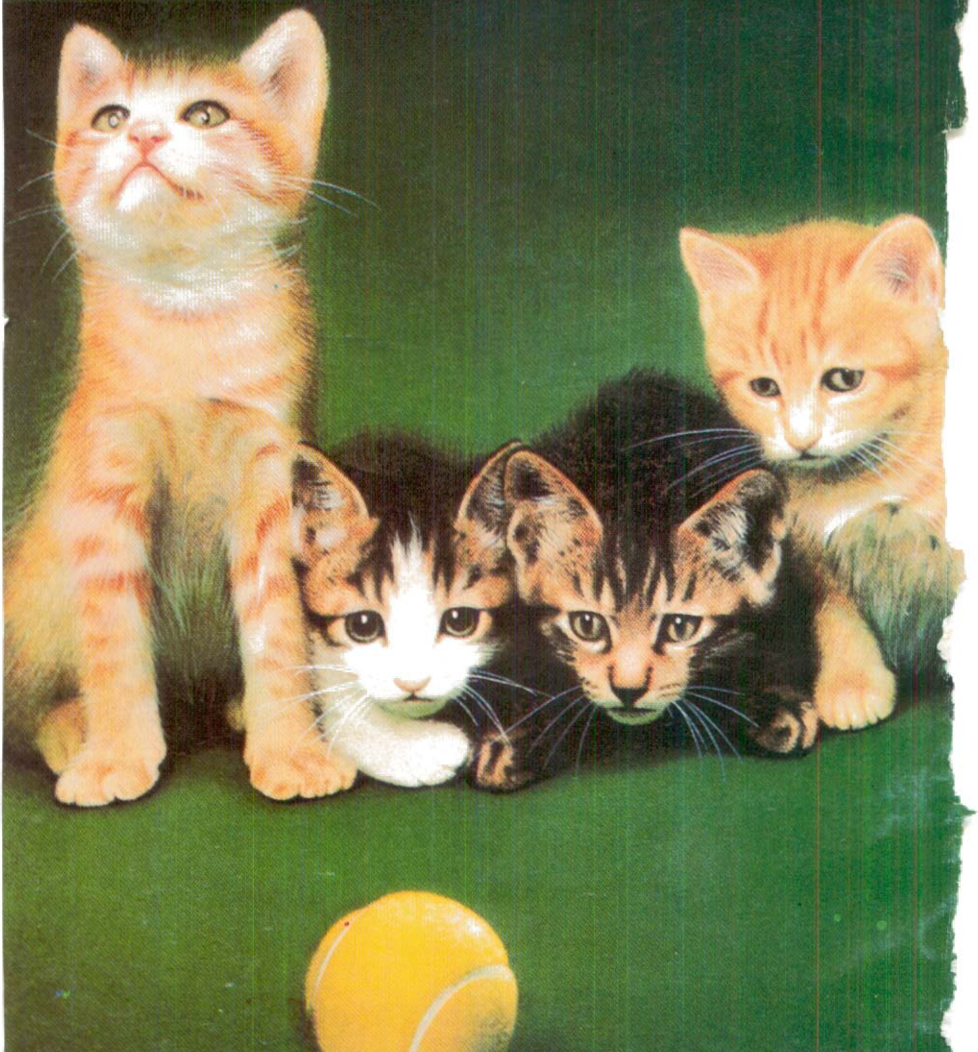

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں!
صرف ٹپال ہی کے سافٹ پیک (Soft Pack)
خودکار مشینوں پر تیار ہوتے ہیں۔
چائے میں چائے!
ٹپال چائے
دانےدار
لیف بلینڈ
IBLAGH ابلاغ

دنیا بھر میں آزمودہ
نیا
FRESHMINT
FLUORIDE
macleans
UNIQUE FORMULA for healthy teeth AND GUMS
پلاک دور
PLAQUE FIGHTING
PA1
سے پلاک دور!
پلاک کیا ہے؟
پلاک جراثیم کی چکنی تہہ ہے جو دانتوں کی سطح پر جم جاتی ہے۔ اگر اس کو دور نہ کریں تو اس کی وجہ سے دانتوں کو کیڑا لگتا ہے۔ پلاک مسوڑوں کی بیماری کا سبب ہے جس سے دانت گرتے ہیں۔
نیا میکلینس - پلاک سے حفاظت کے لئے دنیا بھر میں آزمودہ۔
میکلینس نے مسوڑوں کی صحت کے لئے اپنے فلورائیڈ ٹوتھ پیسٹ کے نئے منفرد فارمولے میں PA1 کا اضافہ کیا ہے۔ یہ خصوصی جراثیم کش جزو کلینیکل تجربات میں پلاک سے بچاؤ کے لئے آزمایا ہوا ہے، اور فلورائیڈ کیڑے سے حفاظت کے لئے مؤثر ہے۔
MILDMINT
macleans
FRESHMINT
macleans
FIGHTS DECAY • FIGHTS PLAQUE
پلاک دور۔
دانت مضبوط

ASIATIC

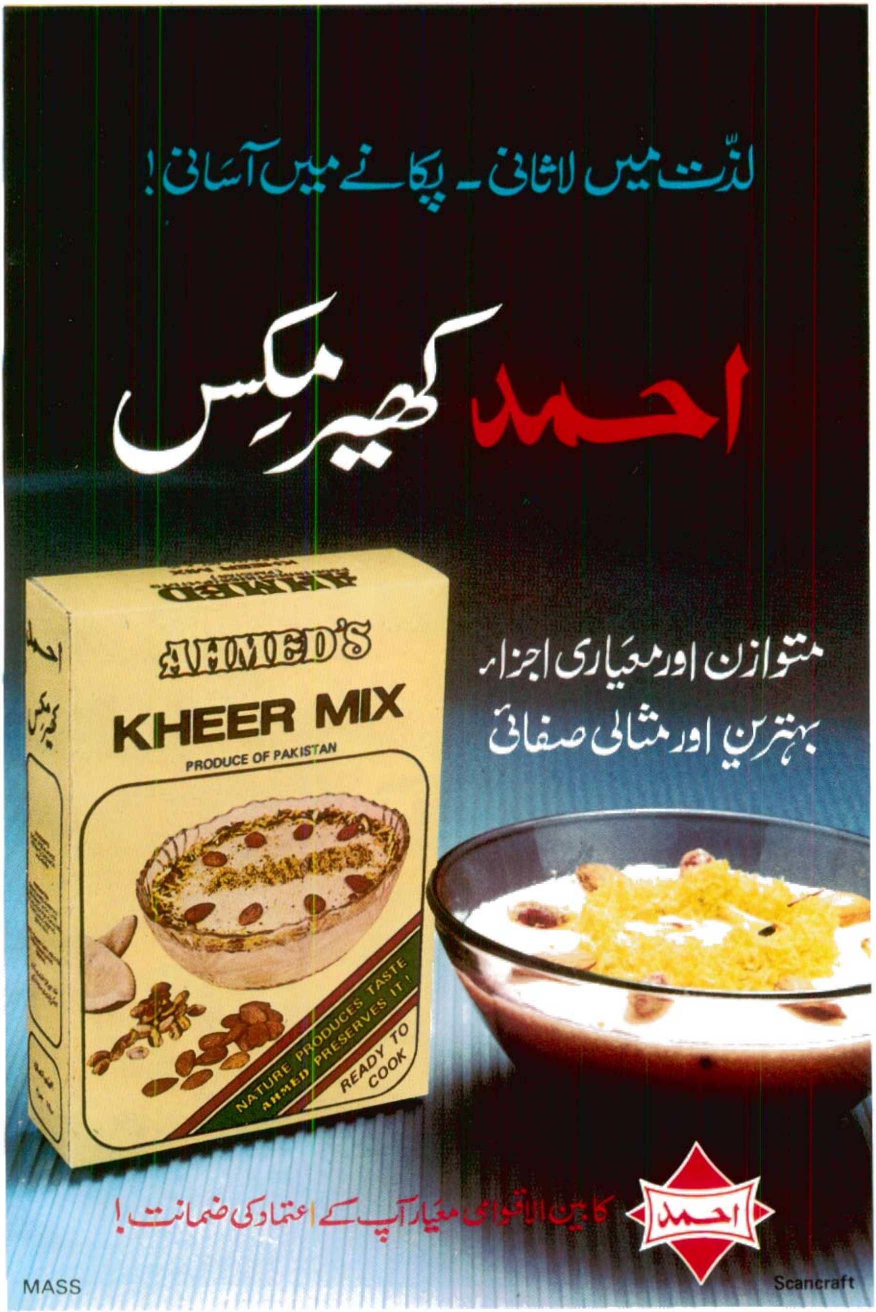
لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی !
احمد کھیر مکس
AHMED'S
KHEER MIX
PRODUCE OF PAKISTAN
NATURE PRODUCES TASTE
AHMED PRESERVES IT!
READY TO COOK
متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی
احمد
کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت !
MASS
Scancraft

سب دوستوں کے لئے
ایک دوستانہ مشورہ
پیارے دوستو!
آپ کی طرح مجھے بھی سوئیٹس، ٹافیز اور ببل بے حد پسند ہیں لیکن میں خریدتے وقت بہت احتیاط
سے کام لیتی ہوں اور صرف مے فیئر خریدتی ہوں۔
کیونکہ یہ بہترین اجزائے صحت کے اصولوں پر تیار ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔
آپ سب دوستوں کے لئے 'میرا دوستانہ مشورہ'
ہمیشہ مے فیئر کی سوئیٹس اور ٹافیز کھائیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔
■ مے فیئر سوئیٹس اور ٹافیز ■ مے فیئر ببل ■ مے فیئر ملکا چیو
■ مے فیئر فروٹا چیو (اورنج اور اسٹرابیری)
Fruta Chew
Fruta Chew
Milka Chew
mayfair
-the sweet favourites

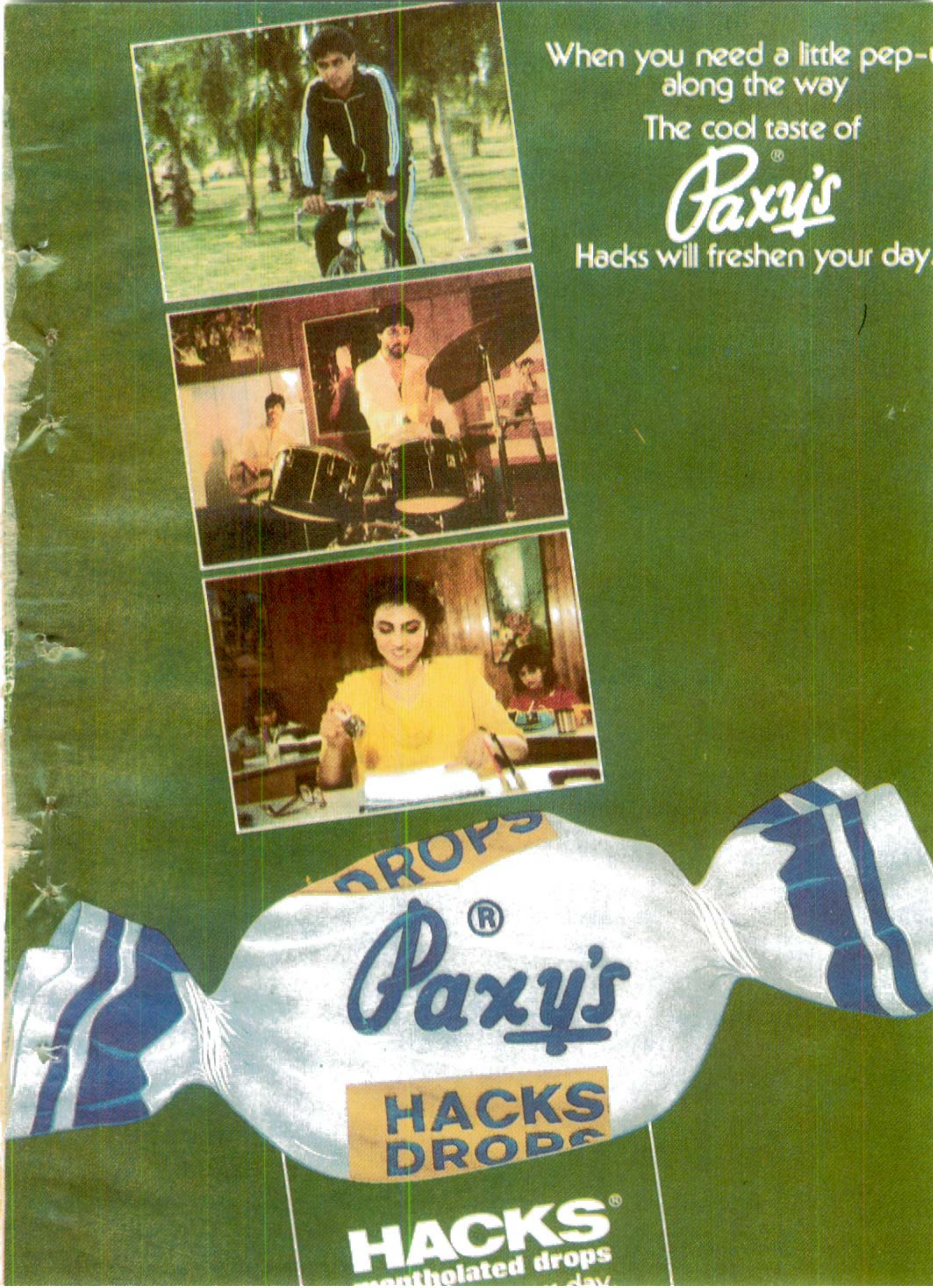
When you need a little pep-
along the way
The cool taste of
Paxy's
Hacks will freshen your day.
Paxy's
HACKS
HACKS

اب ہر ہفتے ۱۴ پروازیں

کراچی
فیصل آباد
کراچی

پاکستان انٹرنیشنل نے کراچی اور فیصل آباد کے درمیان جمعرات کو ایک براہ راست اضافی پرواز متعارف کی ہے۔ اس پرواز کے اضافے سے اب پی آئی اے مندرجہ بالا رُوٹ پر صبح کی سات اور شام کی سات پروازوں کی سہولت پیش کرتی ہے۔

روزانہ	بدھ	منگل	*روزانہ علاوہ منگل ـ بدھ		دن		*روزانہ علاوہ منگل ـ بدھ	منگل	بدھ	روزانہ
343	341	367	337		پرواز نمبر ـ پی کے		336	366	340	342
737	737	737	737		طیارہ		737	737	737	737
FY	FY	FY	FY		درجہ		FY	FY	FY	FY
1430	2310	2330	2359	آمد	کراچی	روانگی	2000	1730	1630	1030
	2210 2130			روانگی آمد	سکھر	آمد روانگی			1730 1810	
		2205 2130		روانگی آمد	ملتان	آمد روانگی		1855 1930		
1250	2015	2050	2220	روانگی	فیصل آباد	آمد	2140	2010	1925	1210

* یہ نئی پروازوں کو ظاہر کرتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا پی آئی اے کے بکنگ آفس سے رابطہ کریں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD) IAL-PIA-1-91

manhattan PAKISTAN

آنکھ مچولی

نئی نسل کے ادب کا امین بین الاقوامی معیار

بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرنے والا پاکستانی بچوں کا واحد ماہنامہ

مدیرِ اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول

تجمل حسین چشتی

مشاورت

مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیرانِ اعزازی

طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت

شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات

محمد عمر فان

سرکولیشن

ریاض احمد

نمائندہ امریکہ

عبدالرشید خان

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد ۵ ◎ شمارہ ۱۰ ◎ اپریل ۱۹۹۱ء ◎ رمضان/شوال ۱۴۱۱ھ ◎ فون ۲۹۹۱۷۸

ناشر: ظفر محمود شیخ ، طابع: زاہد علی ، مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ، کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی - گرین گائیڈ اکیڈمی - ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

قیمت

۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال

حسنِ ترتیب

ادارہ	تاریخ کے دریچے سے	۸
ظفر محمود شیخ	پہلی بات	۹
ضیغم حمیدی	نماز (نظم)	۱۱
ادارہ	ڈیئر ایڈیٹر	۱۳
ادارہ	بے قرار مامتا	۱۸
سلمٰی سلیم	ماں کی مُحبّت	۲۱
عمران مشتاق	سبق جو یاد رہ گیا	۲۳
سعید تنولی	منافع کیا ہوتا ہے	۲۷
سیّدہ نسرین اعجاز	پاگل کون	۳۱
طاہر مسعود	ٹامی زندہ ہے	۴۰
محمد کاشف قریشی	خلا امن کا پیامبر	۴۶
سیّد نظر زیدی	آزادی	۴۹
ش، م، خ	گینز بک کی کہانی	۵۹
لطائف	ڈنڈا ڈولی	۶۳
شازیہ فرحین	خود غرض	۶۷

حسنِ ترتیب

۷۱	فطرت کی دُنیا	شین فاروقی
۷۵	پھول اور امّی ابّو	سدیم مُغل
۷۷	عیدی	منیر احمد راشد
۸۳	رشوت (نظم)	شاھنواز فاروقی
۸۴	خوفناک جنگ خطرناک ہتھیار	سید طارق محمود
۹۱	جب کشتی ڈوب گئی	شاھنواز فاروقی
۱۰۰	پھانسی کا درخت (نظم)	عنبر چغتائی
۱۰۳	ندامت کے آنسو	راشد نعمان صدیقی
۱۰۷	منزل ہے کہاں میری	محمد عادل منہاج
۱۱۲	ہائے وہ دن	احمد حماد سعیدی
۱۱۴	مہمان نواز	بن یامین
۱۱۹	مائیں کیسی کیسی	نائلہ صدیقی
۱۲۳	کم سن قلمکار	قارئین
۱۳۳	روشن مثال	تعارف
۱۳۸	امّی ابّو کا صفحہ	ہما سلیم

تاریخ کے دریچے سے

سلطان ملک شاہ سلجوقی ایک مرتبہ اصفہان (ایران) کے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ کسی گاؤں میں قیام ہوا۔ وہاں ایک غریب بیوہ کی گائے تھی جس کے دودھ سے تین بچوں کی پرورش ہوتی تھی۔ شاہی آدمیوں نے اس گائے کو ذبح کر کے خوب کباب بنائے۔ غریب بڑھیا کو خبر ہوئی۔ وہ بدحواس ہو گئی۔ شاہی آدمیوں کا مقابلہ۔ کوئی داد فریاد سننے کو تیار نہ تھا۔ اس پر لاوارث اور ایک غریب عورت! ساری رات اس نے پریشانی میں کاٹی۔ صبح ہوئی۔ دل میں خیال آیا، کوئی نہیں سنتا نہ سہی۔ کیا بادشاہ بھی نہ سنے گا؟ جسے خدا نے غریبوں کو ظالموں سے نجات دینے کے لئے اتنی بڑی سلطنت دی ہے۔ بادشاہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ فلاں راستے سے شکار کو نکلے گا۔ وہ اصفہان کی مشہور نہر زنداؤد کے پل پر جا کھڑی ہوئی۔ جب بادشاہ پل پر آیا تو بڑھیا نے ہمت اور جرأت سے کام لے کر کہا،

"اے الپ ارسلاں کے بیٹے! میرا انصاف اس پل پر کرے گا یا پل صراط پر۔ جو جگہ پسند ہو، انتخاب کر لے۔"

بادشاہ کے ہمراہی بڑھیا کی اس بیباکی پر حیرت زدہ ہو گئے۔ بادشاہ گھوڑے سے اتر پڑا۔ بڑھیا سے کہا۔ "پل صراط کی طاقت نہیں ہے۔ میں اسی جگہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہو کیا کہتی ہو؟"

بڑھیا نے اپنا سارا قصہ بیان کیا۔ بادشاہ نے بڑھیا کی داستان سن کر لشکریوں کی اس نالائق حرکت پر افسوس ظاہر کیا۔ اور ایک گائے کے عوض اس بڑھیا کو ستر گائیں دلائیں اور مالا مال کر دیا، جب بڑھیا نے یہ کہا۔ تمہارے عدل و انصاف سے میں خوش، میرا خدا اور رسولؐ خوش، تو بادشاہ گھوڑے پر سوار ہوا۔

پہلی بات

عید مسلمانوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ تہوار کے معنی ہیں خوشی کا دن۔ اور عید کی خوشی بہت سی باتوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً روزہ رکھنے کی خوشی، اپنی خواہشوں پر قابو پانے اور نفس کو مارنے کی خوشی، اللہ کو راضی کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کی خوشی۔ گویا ان ہی خوشیوں کو ظاہر کرنے کے لئے عید کے دن ہم نئے نئے کپڑے پہنتے ہیں، ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، اچھے اچھے کھانے، مٹھائیاں اور سویاں کھاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو عید کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر ہر قسم کی اخلاقی پابندیاں ختم ہو گئیں اور اب وہ ہر طرح کی بدمستی کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ اور اس کا مظاہرہ وہ چاند رات ہی سے شروع کر دیتے ہیں۔ سڑکوں پر غل غپاڑہ، پٹاخوں اور فائرنگوں کا شور، موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں پر ادھم بازی، وڈیو اور آڈیو کیسٹوں پر گانے اور فلمیں دیکھنے کا سلسلہ۔ بسا اوقات تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے روزے ختم نہیں ہوئے۔ شیطان آزاد ہو گیا۔

دیکھا جائے تو تہوار منانے کا یہ انداز مسلم نوجوانوں کو زیب نہیں دیتا۔ خواہ وہ تعداد میں تھوڑے ہوں یا زیادہ۔ اسلام خوشی منانے سے نہیں روکتا، البتہ وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ مسلمان اپنے تہواروں میں بھی اسی تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کریں جس کی تعلیم ان کا دین دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی خوشی میں اپنے فرائض سے غافل نہ ہو جائیں۔ عید کے روز نماز پڑھنا، قبرستان جانا اور غریبوں کو فطرہ دینا اسی لئے لازم کر دیا گیا ہے تاکہ ہم مسرت کے ان لمحات میں اللہ کا شکر بجالائیں، اللہ کے پاس چلے جانے والے بندوں کی مغفرت کی دعائیں مانگیں اور اپنے مجبور اور بے کس بھائیوں کو یاد رکھیں۔

بے شک عید خوشی کا دن ہے۔ لیکن سچی خوشی صرف نئے کپڑے پہننے، عیدی وصول کرنے اور سویاں کھانے سے حاصل نہیں ہوتی یہ تو اپنے بھائیوں کی مدد کرنے اور ان کو کچھ دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب آپ کی مدد سے آپ کا ایک بھائی نئے کپڑے پہنتا ہے تو اس سے روح میں جو آسودگی پیدا ہوتی ہے اسی اطمینان کا نام سچی خوشی ہے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے نزدیک تہوار میں رنگ پھینکنے، کلبوں میں ناچنے گانے ہی کا نام خوشی ہے لیکن ہمارے مذہب میں خوشی ظاہر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے دینی بھائی کو آگے بڑھ کر گلے لگائیں تاکہ دونوں کے دل محبت سے بھر جائیں اور سینے آئینے کی طرح شفاف ہو جائیں۔ اور جب وہ ایک دوسرے کے گھر جائیں تو ان کے منہ میٹھے ہوں، چھوٹے، بڑوں کو ادب سے سلام کریں اور بڑے شفقت سے انہیں پیار کر کے عیدی کا تحفہ دیں۔ عید کی ان رسومات کو آپ غور سے دیکھئے تو احساس ہو گا کہ اس کا مقصد انسان کو انسان سے قریب کرنا اور انسان کو خدا سے نزدیک لانا ہے۔ لیکن اتنے لطیف طریقے سے کہ آدمی خوشی خوشی عید مناتا ہے اور ساتھ ہی وہ مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے جس کے لئے عید آتی ہے۔ لیکن ہمارے طرز عمل سے اگر یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو پھر کیا ایسی عید کو عید کہیں گے؟ یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے!

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

باادب باملاحظہ ہوشیار

آنکھ مچولی کا حیرت ناک نمبر آرہا ہے

اس نمبر کی چند حیرت بکھیرنے والی پھلجڑیاں

○ ...... وہ کہانیاں جنہیں پڑھ کر آپ مارے حیرت کے پلکیں جھپکنا بھول جائیں۔

○ ...... ایسے واقعات جن کو پڑھ کر آپ کے منہ حیرت سے انگریزی حرف ○ کی طرح ہو جائیں۔

○ ...... ایسی تصاویر جن پر آپ کے لئے یقین کرنا مشکل ہو جائے۔

○ ...... علامہ حیرت کے حیرت ناک انکشافات......

○ ...... حیرت کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے قصے اور حیرت کی کشتی میں سوار حیران کن "تحفہ"

○ ...... اس کے علاوہ وہ سب کچھ جو آپ کو حیرت میں ڈال دے

آپ بھی اس نمبر کے لئے جلد کچھ لکھ کر بھیجئے۔

آنکھ مچولی کا "حیرت ناک نمبر۔"
آپ پڑھیں گے جیسے جیسے
آپ کہیں گے کیسے کیسے؟

نماز

دین و دنیا سنوارتی ہے نماز
سوئے جنّت پکارتی ہے نماز
دین کا یہ ستون کہلائے
قلب اور روح کو یہ گرمائے
ہر برائی سے روکتی ہے یہ
گندی باتوں پہ ٹوکتی ہے یہ
دور رکھتی ہے ہم سے شیطاں کو
پختہ کرتی ہے دین و ایماں کو
آدمی سیدھی راہ چلتا ہے
دل کا ہر خوف اس سے ٹلتا ہے
ہر مسلماں کا روپ کھلتا ہے
اس سے دل کو سکون ملتا ہے
بچّو! ہے نیکیوں کی یہ سرتاج
تم بھی بن جاؤ پھر نمازی آج

ضیغم حمیدی

Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر
سی
لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈ فِش ڈیلکس پینسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 293451
جہاں چلے، رواں چلے
Goldfish

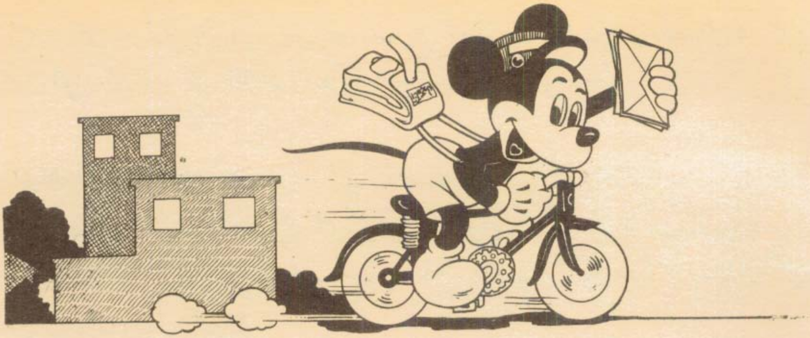

ڈیئر ایڈیٹر

فریحہ وارثی، جہانگیر روڈ، کراچی ...... ڈیئر انکل، رسالے کے ساتھ "تتلی" کا تحفہ بہت پسند آیا۔ کیا ہر شمارے کے ساتھ "تتلی" ملا کرے گا؟ اور ہاں خطوط کی لکھائی باریک کر دیجئے تاکہ زیادہ سے زیادہ خطوط اس میں شامل ہو سکیں۔

○ ...... تتلی کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ویسے رنگ برنگی تتلیاں تو بچوں کو اچھی لگتی ہی ہیں۔ فی الحال تو تتلی ایک تحفہ ہے، یہ تحفہ دوبارہ بھی مل سکتا ہے۔ باریک لکھائی کے مشورے پر عمل کیا جائے گا۔

شوکت جاوید، کیماڑی، کراچی ...... ڈیئر ایڈیٹر کا نام تبدیل کر کے "خوش آمدید" اور "ڈنڈا ڈولی" کا "مسکراتے رہو" رکھ دیجئے۔ اور ایک سلسلہ حیرت انگیز کا بھی شروع کیجئے۔

○ ...... "خوش آمدید" کا لفظ سنتے ہی شادی ہال کا خیال آتا ہے۔ جہاں بڑے بڑے حروف میں یہ لکھا ہوتا ہے۔ "مسکراتے رہو" پرانا نام ہے "حیرت انگیز" کے سلسلے کے بجائے ہم "حیرت ناک نمبر" شائع کر رہے ہیں۔

محمد شفیق شان، ضلع وہاڑی ...... جنوری کے شمارے میں پرویز آرائیں کی تحریر "نیم حکیم" نقل شدہ ہے۔ انہیں بلیک لسٹ کر دیں۔ وہ پہلے بھی ایک رسالے میں بلیک لسٹ ہو چکے ہیں۔

○ ...... محمد پرویز آرائیں اتنی دیدہ دلیری سے دوسروں کی تحریروں پر ڈاکہ ڈالتے ہوں گے۔ اس کا تو ہمیں اندازہ بھی نہ تھا۔ ان کے لئے تو بلیک لسٹ کی سزا بہت ہی کم ہے۔

احمد فواد سعیدی، اسلام آباد ...... اگر آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا تو میں آپ سے کٹّی کر لوں گا۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ جب اپنی تحریر کسی ایڈیٹر کو بھیجی جائے تو اس سے بنا کے رکھنی چاہئے۔
○ ...... ماشاء اللہ آپ تو بڑے ہوشیار ہیں۔ مگر آپ نے تو "بنا کے رکھنے" کے بجائے کٹّی کر لینے کی دھمکی دی ہے۔ اسے ہم کیا سمجھیں؟

شیخ محمد شاہد، لاہور ...... ہم نے ایک شخص کو جو اسمگلنگ میں ملوث تھا۔ گرفتار کرا دیا۔ لیکن اگلے ہی دن وہ تھانے سے چھوٹ گیا۔ ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب مجھے ایک منظّم گروہ کی سن گن ملی ہے میں نے کوشش کر کے اس کا علامتی نشان بھی جان لیا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔
○ ...... ہمارا مشورہ ہے کہ آپ خیالی دنیا سے باہر نکل آیئے اور ملازمت کے ساتھ لکھنے پڑھنے پر توجہ دیجئے۔

پاکیزہ فاروقی، راولپنڈی ...... انکل! آپ سے گزارش ہے کہ ایک سلسلہ شروع کیجئے جس میں نشانِ حیدر پانے والے شہداء کے بچپن، تعلیمی اور عسکری زندگی کے بارے میں بتایا جائے۔ امید ہے تجویز پسند آئے گی۔
○ ...... تجویز اچھی ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ جو بولے وہی کنڈی کھولے تو مطلب یہ ہے کہ اس موضوع پر یہ مضامین آپ ہی لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔ ہم شکریئے اور معاوضے کے ساتھ شائع کریں گے۔

محمد عثمان بلوچ، کراچی ...... فروری کا آنکھ مچولی پسند آیا۔ کیا آپ قلمی تعارف چھاپتے ہیں۔ اگر چھاپتے ہیں تو بغیر تصویر کے کتنے اور تصویر کے ساتھ کتنے پیسے لیتے ہیں۔ کیا آپ کے رسالے میں فون ہے۔ نمبر کیا ہے؟
○ ...... میرے عزیز ...... آپ کی بیشتر باتوں کا جواب آنکھ مچولی میں موجود ہے۔ تصویر چھاپنے کے لئے

پیسے...... لاحول ولاقوۃ۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

فرحین، کراچی ...... میں اگر اپنی جیب خرچ سے کسی یتیم خانے میں رسالہ لگوانا چاہوں تو کل کتنا خرچہ آئے گا اور اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مجھے امید ہے میری طرح اور دوست بھی اس کام میں حصہ لیں گے۔
○ ...... ماشاء اللہ بہت نیک خیال ہے۔ آپ جس یتیم خانے یا ادارے میں رسالہ بھجوانا چاہیں اس ادارے کا نام پتہ لکھ کر رسالے کا سالانہ چندہ ہمیں بھجوا دیں۔ رسالہ پہنچ جایا کرے گا۔ خدا دوسروں کو بھی نیک توفیق دے۔ (آمین)

صولت رعنا چوہدری، راولپنڈی ...... بھائی جان! میرے بہن بھائی ہنستے ہیں کہ میں اتنی بڑی ہو کر یہ بچوں کے رسالے پڑھتی ہوں مگر اکثر میں انہیں یہ رسالے پڑھتے ہوئے پکڑ لیتی ہوں۔ رسالے کی تعریف اور کیا کروں سبھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ کیا آپ کے پاس شمس الدین عظیمی صاحب کا پتا ہے۔
○ ...... کس سلیقے سے آپ نے تعریف کی ہے، شکریہ، شکریہ۔ عظیمی صاحب کو آپ "جنگ" اخبار کے پتے پر خط لکھ سکتی ہیں۔

فری، گجرانوالہ ...... مجھے پچھلے سال کا اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر اور اس سال کا جنوری کا آنکھ مچولی چاہئے۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو قارئین میں سے کسی کے پاس ہو تو اس سے دلا دیں۔
○ ...... ہمارے پاس جو شمارے ہیں اس کے لئے آپ رسالے کی قیمت منی آرڈر کر دیجئے۔ قارئین میں سے کسی کے پاس ہو تو ہمیں نہیں معلوم۔

رمضان علی شاہ، اوکاڑہ ...... اطفال نمبر میں ایک مضمون "بچوں کا اخبار" کے بارے میں ہے۔ کیا آپ مجھے اس اخبار کی ایک کاپی بھیج سکتے ہیں۔ مجھے پرانے اخبارات اور کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔
○ ...... "بچوں کا اخبار" بہت نایاب رسالہ ہے۔ اس کی ایک آدھ کاپی بھی کسی کے پاس ہو تو اسے تبرک سمجھئے۔

عبید رضا، اوباڑو ...... میں نے چار خط بھیجے مگر ایک بھی شائع نہیں ہوا، تعارف بھیجا مگر شاید اچھا نہیں لگا

کیونکہ ہم سندھی ہیں میرے پاس پندرہ سولہ کہانیاں ہیں (اپنی لکھی ہوئی) حیرت ناک نمبر، کے لئے بھیج دوں؟

○ ...... پیارے بھائی، بے شمار لکھنے والوں کے خط شائع نہیں ہو پاتے۔ کیونکہ ہمارے پاس جگہ کی کمی ہے۔ اس لئے کبھی خط نہ چھپے تو اسی طرح نہ سوچا کیجئے۔ کیونکہ آپ سندھی سے پہلے مسلمان ہیں، اس کے بعد پاکستانی ہیں اور ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایسی باتیں پڑھ کر ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ کہانیاں آپ شوق سے بھجوایئے۔

شازیہ عزیز، شاہ فیصل کالونی کراچی ...... "خوفناک نمبر" کب تک نکالنے کا ارادہ ہے۔ پہلے ہر ایک ماہ کے بعد آپ کوئی نہ کوئی مقابلہ کرواتے تھے، اب نہیں کرواتے۔ کیوں؟

○ ...... "خوفناک نمبر" کے دو شمارے سے آپ کا جی نہیں بھرا۔ ساتھیوں کو اب ہم مزید ڈرانا نہیں چاہئے۔ ہاں انہیں حیران کرنے کے لئے "حیرت ناک نمبر" کی تیاریاں جاری ہیں۔ مقابلے اب بھی گاہے گاہے ہوتے رہتے ہیں۔

محمد نسیم رفیع، سکھر ...... "تتلی" کا تحفہ کمال کا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی نے بغیر وقفے کے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ رنگین صفحات کا سلسلہ جاری رکھئے گا۔

○ ...... "تتلی" اصل میں آپ کے اور تمام ساتھیوں کے چھوٹے بھائی بہنوں ہی کے لئے تحفہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ پسند آیا۔ آپ پریشان نہ ہوں رنگین صفحات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

عمران نور، (؟) ...... ایک کہانی لکھی ہے مگر بھیجتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ آپ کہیں تو بھیج دوں۔

○ ...... کیوں بھئی اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اچھی نہ ہوئی تو زیادہ سے زیادہ نہیں چھپے گی۔ اور کچھ تو نہیں ہو گا۔ فوراً بھیج دیجئے۔

مجاہد قاسم علی شاہ، رینالہ خورد، ضلع اوکاڑہ ...... انکل! کیا گرین گائیڈ اکیڈمی نے بچوں کی اور کتابیں بھی شائع کی ہیں؟

○ ...... اکیڈمی نے کئی کتابیں چھاپی ہیں اور ان کا اشتہار رسالے میں چھپتا رہا ہے۔ فی الحال دو کتابوں کے نام سن لیجئے۔ حق اسکواڈ، مصنف اخلاق احمد اور "سب سے بڑا انسان" مصنف سیّد نظر زیدی۔

PID - Islamabad

PARAGON

کتنے دکھ جھیلے ہیں ماں نے

اپنے اس بچے کی خاطر۔

ماں اور اولاد کے درمیان محبت کا رشتہ صرف انسانوں ہی میں نہیں ہوتا بلکہ اللہ نے جانوروں کو بھی ایسے ہی جذبات اور احساسات عطا کئے ہیں نیو میکسیکو (امریکہ) میں پیش آنے والا ایک واقعہ کم از کم امریکہ اور مغرب کی ان ماؤں کو شرمندہ کرنے کے لئے کافی ہے جو اپنے بچوں کے معاملے میں بے حس، لاپروا اور یکسر غافل رہتی ہیں۔

نیو میکسیکو کے "ساندیا پہاڑوں" میں ایک بیئر ماما اپنے بے بی بیئر کے ساتھ رہا کرتی تھی، چونکہ یہاں غذاؤں کی قلت تھی لہٰذا ماں اور بچہ غذا کی تلاش میں اکثر کہیں نہ کہیں نکل جاتے۔ ایک روز تلاش رزق کے لئے ماما بیئر اور بے بی بیئر ایک ایسے علاقے میں چلے گئے جہاں کی بھول بھلیوں نے ماں اور بچے کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

بچے کی تلاش میں ماما بیئر نے درختوں کی چوٹیاں ندی نالے سبھی کچھ دیکھ ڈالے۔ مگر بچے کا سراغ نہ لگ سکا۔ بالآخر ماما بیئر بجلی کے ایک بلند پول پر چڑھ گئی، اس کا خیال تھا کہ پول کی بلندی سے نیچے جھانکنے پر شاید اس کا بچہ نظر آجائے مگر ۳۰ فٹ اونچا بجلی کا یہ خطرناک پول جس کے تاروں میں سات ہزار دو سو وولٹ بجلی دوڑ رہی تھی، اچانک شارٹ ہوگیا اور ماما ایک بڑے دھماکے کے ساتھ زمین پر آرہی۔

اللہ تعالیٰ کو ماما بیئر کی زندگی بچانا مقصود تھا۔ ماما بیئر کو معمولی چوٹیں آئیں مگر وہ جلدی ہی ٹھیک ہوگئی۔ بیئر کو اس کا بچہ بھی مل گیا۔ ان دونوں کو ریو گرانڈ زولوجیکل پارک میں لایا گیا جہاں سے بعد میں انہیں موسم بہار گزارنے کے لئے کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔ دونوں ماں اور بچہ آج کل بہت خوش ہیں۔

شعبۂ تحقیق و تلاش
ماہنامہ آنکھ مچولی

موت کے خوف سے بے پروا
بیقرار مامتا

تفصیل سامنے پڑھیے

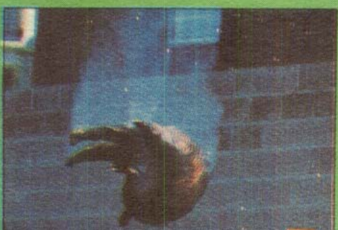

١ ـ بچّے کی تلاش میں بیئر ماما بجلی کے خطرناک پول پر چڑھ گئی ،
٢ ـ سات ہزار دو سو وولٹ کا شدید شارٹ لگنے کا منظر ،
٣ ـ ٣٠ فُٹ کی بلندی سے زمین پر گرتے ہوئے ،
٤ ـ موت سے بچ جانے کے بعد بچّے کے لئے بے قرار ماں ـ ماما بیئر

شعبۂ تحقیق وتلاش ماہنامہ آنکھ مچولی

نظروں کو اپنی لاکر تھوڑا قریب دیکھو   ماؤں کی چاہتوں کے منظر عجیب دیکھو

ماں کے سینے سے لپٹا رہتا ہوں
ہر اِک خطرے سے بچا رہتا ہوں

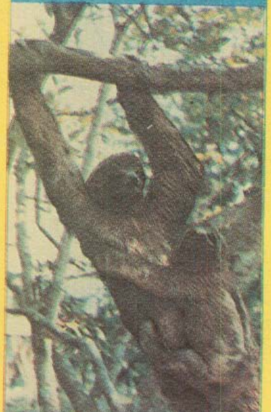

بچھو کے بچے ماں کی کمر پر

مُنہ میں دَبا کے شیرنی بچے کو جا رہی ہے

خطرہ ہے ! مُنہ میں آؤ

تھیلی میں اپنی ماں کی رہتا ہوں میں مزے سے

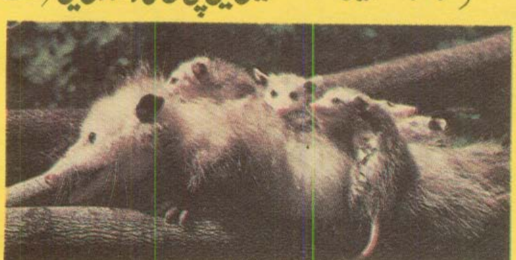

ماں کے قریب رہنا خطرے سے دُور رہنا

ماں کی محبتوں کی کیا کیا کہانیاں ہیں

سلمیٰ سلیم

بچّے کے لئے سب سے زیادہ محفوظ جگہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ اس گود میں حفاظت ہی نہیں محبت اور سکون بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بڑائی دیکھئے کہ اس نے یہ خوبیاں انسانوں کے ساتھ ساتھ حیوانات کو بھی دی ہیں۔ آج ہم آپ کو حیوانات کی ماؤں کی چند دل کو چھو لینے والی باتیں بتائیں گے۔

شیرنی کے بچے پیدائش کے وقت دیکھنے اور چلنے پھرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیرنی کسی خطرے کی حالت میں یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے وقت اپنے بچوں کو منہ میں دبا کر ساتھ لے جاتی ہے۔ یہ کام وہ اتنی نفاست سے کرتی ہے کہ بچوں کے جسم پر معمولی سی خراش تک نہیں آتی۔

مادہ بن مانس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تین برس تک اپنے بچوں کو کھلاتی پلاتی ہے اور ہر وقت انہیں اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودتے ہوئے بھی اس کے بچے اس کے سینے سے چمٹے رہتے ہیں۔ برابر کے صفحے پر مندرجہ بالا دونوں مثالیں موجود ہیں۔

اس طرح مادہ کنگارو کے بچے دنیا میں آتے ہی اپنی ماں کے جسم کے ساتھ موجود تھیلی میں چلے جاتے ہیں اور جب تک کافی بڑے نہیں ہو جاتے وہیں رہتے ہیں۔ دنیا میں ایسی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں جو کسی خطرے کے وقت اپنے بچوں کو منہ میں گھسا لیتی ہیں جب خطرہ ٹل جاتا ہے تو وہ انہیں باہر نکال دیتی ہیں ذرا برابر کے صفحہ پر نظر تو ڈالئے۔

امریکہ میں Opossums نام کے بھورے بالوں والے اور کنگارو کی طرح کی تھیلی رکھنے والے جانور کی مادہ بھی اپنے بچوں کو دو ماہ تک اپنی تھیلی میں چھپائے رہتی ہے۔ عام حالات میں اس کے بچے اس کے بالوں سے چمٹے رہتے ہیں۔ اور تو اور زہریلے بچھو کی مادہ بھی اپنے بچوں سے بڑی محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو کئی ہفتے تک اپنی کمر پر لئے لئے پھرتی ہے۔ اور انہیں زمین پر اترنے نہیں دیتی کہ کہیں انہیں کچھ ہو نہ جائے۔ آپ ان سب باتوں کو تصاویر کی صورت میں برابر کے صفحے پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ان سب مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں عظیم ہوتی ہے۔ انسان ہی کی نہیں حیوانوں کی بھی۔

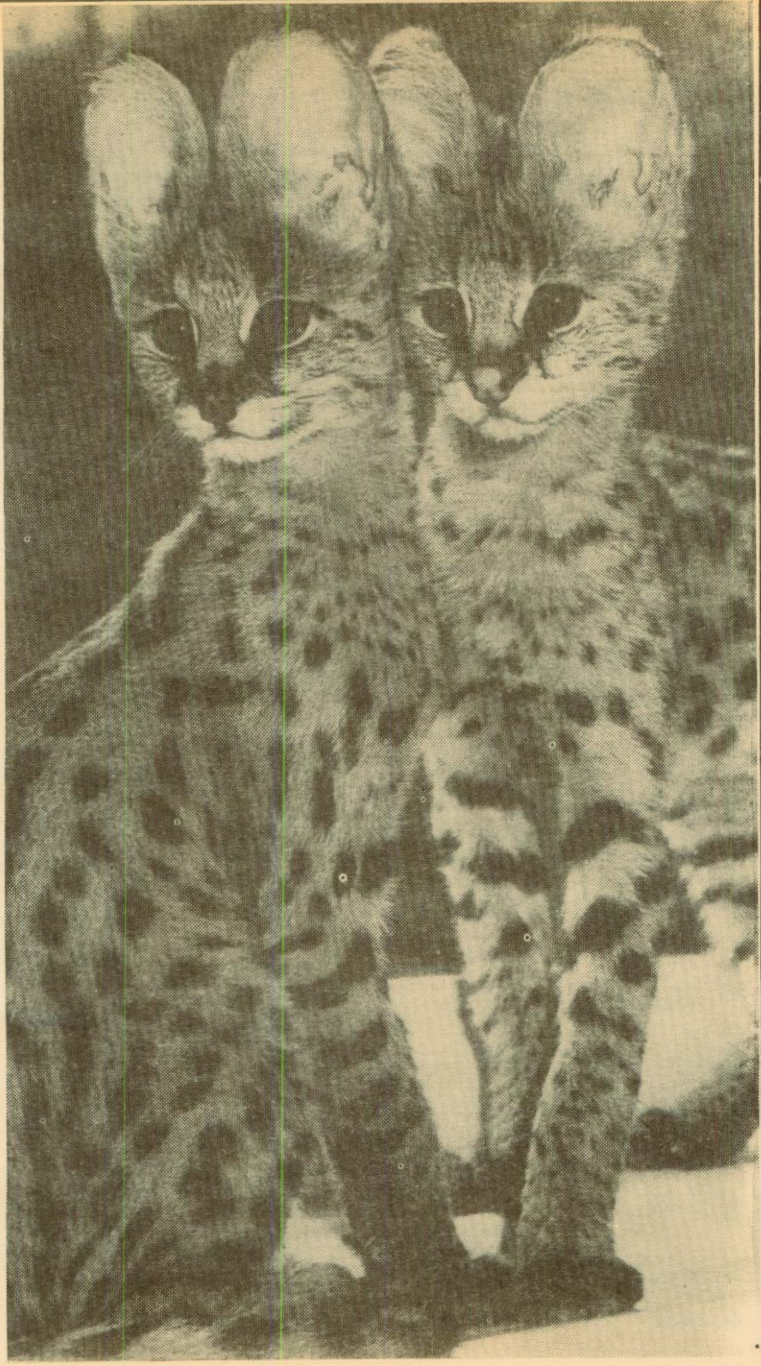

"کان کھڑے ہونا" سنا تو بہت تھا مگر دیکھا اب ہے۔

سبق جو یاد رہ گیا

عمران مشتاق

گھر میں سبھی پریشان تھے۔ چار بج چکے تھے اور نیّر ابھی تک اسکول سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ عموماً ڈیڑھ بجے تک گھر آجاتا تھا۔ شکیل بھائی اسکول کا چکر لگا آئے تھے وہ اسکول میں نہیں تھا۔ سبھی بچے گھروں کو جا چکے تھے۔ اونگھتے ہوئے چوکیدار نے یہی بتایا تھا مگر ان کا اطمینان اس وقت تک نہ ہوا جب تک خود انہوں نے پورے اسکول کا ایک چکر نہ لگا لیا۔ اسکول میں ایک بھی بچہ نہیں تھا۔

"ہائے میرے مالک ہمارے اوپر رحم کرنا، میرے بچے کی حفاظت کرنا۔" نانی اماں ہولے ہولے کانپتے ہوئے بار بار دہرا رہی تھیں۔ نجمہ اور ناظمہ کی بے چین نظریں بھائی کے انتظار میں دروازے پہ ہی جمی تھیں۔ اختر اور امجد نیّر کے دوستوں کے گھر گئے ہوئے تھے۔ ابو بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ شکیل بھائی امّی کو سنبھال رہے تھے جن کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ "نہ جانے کہاں رہ گیا۔ آج کل تو بچوں کے اغوا کی وارداتیں بھی بہت ہو رہی ہیں۔ یا اللہ خیر کرنا۔" امی ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "ارے تم خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہی ہو،ابھی آجائے گا،ہو سکتا ہے اپنے کسی نئے دوست کے گھر چلا گیا ہو۔" ابو

کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔ ''نہیں وہ ایسے کہیں نہیں جاتا۔ ضرور کوئی اور ہی بات ہے میرا تو دل ہی ڈوبا جا رہا ہے۔'' امی سینے پہ ہاتھ رکھے سسکنے لگیں۔ ابو نے جواباً کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر کچھ سوچ کر پر تشویش نظروں سے امیّ کی طرف دیکھ کر رہ گئے، بولے نہیں۔

''ہم نیر کو اس کے تمام دوستوں کے گھر دیکھ آئے ہیں وہ کسی کے گھر نہیں گیا۔'' اختر نے اندر آتے ہوئے اطلاع دی۔ امجد بھی اس کے ساتھ تھا۔ ''چھٹی کے وقت اس کے دوستوں میں سے کسی نے اسے دیکھا تھا؟'' ابو نے فکر مندی سے پوچھا۔ ''اسد کا کہنا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی اسکول کے گیٹ سے باہر نکلا تھا پھر نیرؔ گھر کی طرف گیا تھا۔'' امجد نے جواب دیا۔ ''اور وہ گھر تو پہنچا نہیں۔ پھر کہاں گیا؟'' ابو سوچ میں گم ہوتے ہوئے بولے۔ ''اوہ! ہاں بیگم مجھے ذرا دو سو روپے لا کر دو میں پولیس اسٹیشن میں گمشدگی کی رپورٹ تو کروا دوں۔'' ''میں ابھی لاتی ہوں۔'' امی پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہانپتی کانپتی آئیں ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ ''وہاں تو کوئی پیسہ نہیں ہے۔ تمام رقم غائب ہے۔'' ''کیا!!! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ابو چلاّتے ہوئے اندر کی طرف دوڑے۔ سبھی پریشانی کے عالم میں ان کے پیچھے لپکے۔ وہ الماری کے ایک خانے کو چیک کرنے لگے۔ یکے بعد دیگرے وہ تمام خانے چیک کرتے گئے۔ ''یہیں تو رکھے تھے آخر کہاں چلے گئے؟'' ان کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔ ''ابو کیا بہت بڑی رقم تھی؟'' ننھی نجمہ نے معصومیت سے پوچھا۔ ''نہیں کوئی زیادہ رقم تو نہ تھی پر ہمارے لئے کافی بڑی تھی۔'' وہ بے خیالی میں بولے۔ ''معمولی سی رقم تھی، اچھا تم سب لوگ باہر جاؤ مجھے تمہاری امی سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ جیسے ہوش میں آ گئے۔ تشویش و پریشانی میں مبتلا سب کمرے سے نکل گئے صرف امی اور ابو رہ گئے۔ ''کل شام کے بعد سے گھر میں تو کوئی نہیں آیا؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''نہیں کوئی بھی نہیں آیا۔ اور یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرا کوئی بچہ ایسی حرکت کر سکتا ہے۔'' امی نے بتایا۔ ''اس دس ہزار کا تو سوائے تمہارے کسی کو پتہ بھی نہیں۔ ارے ہیں یاد آیا۔'' انہوں نے چونکتے ہوئے کہا، ''نیرّ نے ہماری باتیں سن لی تھیں اسے پتہ تھا، کہیں اس نے تو نہیں.........''

''ارے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میرا نیرّ ایسا نہیں'' امی کا انداز خفگی لئے ہوئے تھا۔

''تم ماں ہو اپنی اولاد کے بارے میں کبھی بھی ایسی بات نہیں سوچ سکتیں۔ لیکن ان روپوں کا علم میرے اور تمہارے علاوہ صرف نیرّ ہی کو تھا۔ ہو نہ ہو یہ اس کی کارستانی ہے۔'' ابو نے کہا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ کل ہی تو یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ نیرّ کے ابو نے آفس سے آ کر جب دس ہزار روپے ان کو دیئے تو وہ حیران رہ گئیں۔

"یہ اتنی بڑی رقم آپ کے پاس کہاں سے آگئی؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔
"یہ مت پوچھو بس یہ سمجھ لو کہ فنانس کارپوریشن کے گھر کے قرضہ کی پچھلی چھ یا سات قسطیں جو ہم نہیں دے سکتے تھے اب ہم آسانی سے دے لیں گے۔"
"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر اصل بات تو یہ ہے کہ یہ رقم آئی کہاں سے؟ آپ کے بنک اکاؤنٹ میں تو چند سو روپے بھی نہیں ہیں۔"
"اگر تم مجبور کرتی ہو تو سنو مجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا پڑا ہے جس کا یہ معاوضہ ہے اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو ہمارا یہ چھوٹا سا گھر کارپوریشن نیلام کر دیتی وہ ہمیں پہلے ہی وارننگ دے چکی ہے۔ سوچو ہم ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کہاں جاتے۔ کرائے کے مکان سے پہلے ہی بڑی مشکل سے جان چھڑائی ہے۔"
"آپ نے یقیناً کوئی غلط کام کیا ہے۔ سچ بتائیں آپ نے کیا کیا ہے؟" انہوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ ایک کلائنٹ کی فائل کی باری دیر میں آنی تھی میں نے اس کی فائل جلدی 'بڑے صاحب' کے پاس بھجوادی، بس اتنا سا کام میں نے کیا ہے جس کا یہ معاوضہ ہے۔" انہوں نے نظریں چُراتے ہوئے جواب دیا۔
"آپ کچھ بھی کہیں مگر آپ نے غلط کام کیا ہے۔ یہ رقم رشوت ہے۔"
"جذباتی مت بنو۔ ٹھنڈے دل سے سوچوگی تو تمہاری رائے بدل جائے گی۔" کمرے میں آہٹ ہوئی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا اپنے سامنے نیرؔ کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئے انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا کہ وہ کب کمرے میں داخل ہوا اس طرح ان کے درمیان بحث ادھوری رہ گئی۔ ابو کمرے سے چلے گئے تھے۔ "ہو سکتا ہے آپ کی بات صحیح ہو لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا کہ یہ پیسے میرے نیرؔ نے لئے ہوں گے۔" امی ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "مجھے تو یقین ہو چلا ہے کہ رقم اور نیرؔ کا اکٹھا غائب ہونا ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔" ابو نے مضبوط لہجے میں کہا۔ امی ابھی جواب میں کچھ کہہ بھی نہ پائی تھیں کہ اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ "شاید میرا نیرؔ آگیا۔" امی دروازے کی طرف لپکتے ہوئے بولیں۔ ابو بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔
"ابو نیرؔ آگیا ہے اس کے ساتھ ایک اور صاحب بھی ہیں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔" شکیل بھائی نے اندر آکر اطلاع دی۔ "تم چلو میں آتا ہوں۔" وہ بولے "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔" امی نے پوچھا۔ ابو جواب دیئے بغیر ڈرائنگ روم کی طرف

بڑھ گئے۔ وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑیں۔

نیرّ کے پاس ہی ایک نوجوان شخص بیٹھا ہوا تھا۔ نیر کے سارے بہن بھائی بھی اندر موجود تھے۔ ان کو آتا دیکھ کر وہ شخص کھڑا ہو گیا۔ "آپ ہی رحمان صاحب ہیں؟" ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "جی ہاں۔ میں ہی رحمان ہوں۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "میرا نام ارشد ہے میں ایدھی ویلفیئر سینٹر سے آیا ہوں۔ آپ کے صاحب زادے نیر رحمان آج دوپہر ہمارے سینٹر پہ آئے اور کہنے لگے کہ وہ دس ہزار روپے صدقہ و خیرات کے لئے دینا چاہتے ہیں۔ ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے ہمیں شک ہوا کہ کہیں یہ روپیہ چوری کا نہ ہو یا کوئی اور بات نہ ہو میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے حقیقت معلوم کرلوں۔" وہ خاموش ہو گیا۔ "نہیں ارشد صاحب میرا بیٹا خدا نخواستہ چور نہیں ہے۔ یہ رقم ہم نے خیرات کے واسطے ہی رکھی تھی۔ اس نے کہیں ہماری بات سن لی اور اس سے شاید صبر نہ ہو سکا اور یہ پیسے لے کر خود ہی پہنچ گیا۔" ابو سے پہلے امی بول پڑیں۔ "مجھے اس بچے کے جذبے نے بہت متاثر کیا ہے۔ مگر یہ ضروری ہے آپ اسے سمجھائیں۔ اس طرح اتنی بڑی رقم لے کر نکل جانا اچھی بات نہیں۔" ارشد صاحب نیرّ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "نہیں اب یہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔" امی نیرّ کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولیں۔ ان کے چہرے پہ مامتا کا نور سا پھیل گیا تھا۔

"تو پھر رحمان صاحب آپ میرے ساتھ سینٹر تک چلیں میں آپ کو رقم کی رسید بنوا دوں۔" ارشد صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلئے۔" ان کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی ہو۔

منافع کیا ہوتا ہے؟

سعید تنولی

ایک طالب علم نے اپنے دادا سے سوال کیا۔ "یہ بتایئے کہ جب تک کوئی آدمی دوسرے کا حق نہ مارے، اسے منافع کیسے ہو سکتا ہے......؟ اس لئے کہ اگر ہر شخص کو اس کا حق ملتا رہے تو منافع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اس طالب علم کا دادا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ نیویارک یونیورسٹی کونسل کا صدر تھا اور فیڈرل بیورو کا سابق صدر رہ چکا تھا۔ اس نے اپنے پوتے کو نہایت آسان اور خوبصورت الفاظ میں بتایا کہ منافع کیا

ہوتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"بیٹا تم نے جو سوال کیا ہے اس کا میں نہایت آسان طریقے سے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ منافع کا مطلب ہرگز کسی کا حق مارنا نہیں ہے۔ اور نہ منافع کسی کی جیب پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس، منافع سرمایہ کاری کا وہ نتیجہ ہے جو نہ صرف سرمایہ کار بلکہ دوسروں کے لئے بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے فرض کرو کہ نہایت قدیم زمانے میں ایک بستی پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔ بستی میں سو افراد ہیں۔ یہ لوگ صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں تو دو وقت پیٹ بھر کھانے کو ملتا ہے۔ ذہانت ان لوگوں میں قطعی نہیں ہے۔

زندہ رہنے کے لئے انھیں پانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بستی کے آس پاس پانی نہیں ہے۔ پہاڑی پر ایک چشمہ ہے۔ جہاں سے اس بستی کے تمام افراد اپنے لئے روزانہ پانی لاتے ہیں۔ بستی سے پہاڑی کی بلندی پر چشمے تک جانے اور واپس آنے میں انھیں ایک گھنٹہ لگتا ہے۔

ایک دن ان سو میں سے ایک شخص کو خیال آتا ہے کہ چشمے کا پانی تو نشیب کی طرف بہتا ہوا ایک پہاڑی غار میں غائب ہوتا ہے۔ بس یہیں سے اسے ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ بستی میں اپنے گھر کے سامنے ایک بہت بڑا گڑھا کھودتا ہے اور پھر اس کے بعد چشمے سے اس گڑھے تک ایک نہر کھودتا ہے۔ اس کی بستی کے باقی ننانوے آدمی روزانہ اسے یہ کام کرتے دیکھتے ہیں انھیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے۔

ایک دن اس سوویں شخص کی نہر مکمل ہو کر اس گڑھے کو پانی فراہم کرنے لگتی ہے جو اس نے گھر کے سامنے کھودا ہے۔ تب وہ ان سب افراد کو جمع کر کے ان سے کہتا ہے کہ اگر وہ روزانہ اس کے لئے دس منٹ کام کرنے لگیں تو وہ پہاڑی پر جاکر پانی لانے کی گھنٹے بھر کی، مشقت سے بچ سکتے ہیں۔ سب اس تجویز کو قبول کر لیتے ہیں۔ یوں وہ گھنٹے بھر کی محنت کی بجائے صرف سوویں کے لئے دس منٹ کام کر کے اپنے پچاس منٹ بچا لیتے ہیں۔ دوسری طرف سوویں آدمی کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ننانوے افراد دس دس منٹ اس کے لئے کام کرتے ہیں گویا اسے ساڑھے سولہ گھنٹے روزانہ کا فاضل کام ان لوگوں سے ملنے لگتا ہے۔ وہ اب کچھ وقت اس نہر کی دیکھ بھال پر خرچ کرتا ہے اور ذہن کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے مزید کام لینا شروع کر دیتا ہے۔

ایک دن نہر کی دیکھ بھال کرتے ہوئے ایک اور بات اس پر منکشف ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ پانی

بلندی سے نیچے آتے ہوئے کنکر، پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں کو بہا لے جاتا ہے۔ یوں وہ پانی میں چھپی ہوئی توانائی کا راز پالیتا ہے اور پھر بہت غور و خوض کے بعد ایک پن چکّی تیار کر کے اس سے اپنا اناج پیسنے لگتا ہے۔

تجربہ کامیاب ہونے کے بعد وہ بستی کے باقی افراد کے سامنے ایک اور تجویز رکھتا ہے۔ "تم سب لوگ جتنی دیر میں آٹا پیستے ہو اگر اس وقت کا دس فیصد حصہ میرے لئے وقف کرو تو تم اس پن چکی سے آٹا پیس سکتے ہو۔" سب لوگ بخوشی اس کی یہ تجویز مان لیتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کا نوے فیصد وقت بچے گا جسے وہ اپنے کسی اور کام میں صرف کر سکتے ہیں۔ اس فاضل وقت میں جو سوویں آدمی کو باقی ننانوے آدمیوں سے حاصل ہوتا ہے وہ ان سے اپنے لئے ایک نہایت اچھا اور آرام دہ مکان تعمیر کراتا ہے۔ سوویں شخص کو اب کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں وہ اپنے لئے زندگی کی تمام ضروریات ان لوگوں کی محنت سے حاصل کرلیتا ہے اور اپنا تمام وقت غور و فکر میں صرف کرتا ہے۔

ایک دن وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بستی کا ایک شخص نہایت عمدہ جوتے بناتا ہے۔ وہ اس شخص سے معاملہ طے کر کے اسے اس بات پر راضی کرلیتا ہے کہ اسے کوئی اور کام کرنے کی ضرورت نہیں، وہ صرف جوتے بنائے اور اس کی تمام ضروریات وہ پوری کرنے کے لئے تیار ہے۔ دوسری طرف وہ باقی اٹھانوے افراد کو اس بات پر راضی کرتا ہے کہ جوتوں کی تیاری میں وہ جتنا وقت صرف کرتے ہیں اس کا دس فیصد وہ اس کے لئے کام کریں تو وہ انھیں جوتے فراہم کرنے کے لئے تیار ہے۔ ظاہر ہے یہ تجویز بھی ان کے فائدے کی ہے۔ وہ اس طرح نوے فیصد وقت بچا کر اپنے لئے جوتے حاصل کر سکیں گے، سو وہ یہ تجویز بخوشی مان لیتے ہیں۔

وقت یونہی گزرتا رہتا ہے اور سوواں شخص باقی اٹھانوے آدمیوں میں سے ایک شخص کو منتخب کر لیتا ہے۔ وہ نہایت عمدہ کپڑے بناتا ہے۔ وہ اس شخص سے بھی معاملہ طے کرلیتا ہے۔ یوں سوویں شخص کی دور بینی کی بناء پر اس بستی میں تقسیم محنت کا تصور ابھر آتا ہے۔ ہر شخص اب صرف وہی کام کرنے لگتا ہے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ اس طرح ہر شخص اب صرف ایک ہی کام پر زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔ ہر شخص اس معاشرے میں، جو کہ اب ذہین افراد پر مشتمل ہے، اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے لگتا ہے۔ لیکن غور کرو کہ اگر پہلے ہی مرحلے پر جب سوویں شخص نے پہاڑ سے نہر نکالی تھی۔ باقی ننانوے آدمی اس سے یہ کہتے کہ "ہم ننانوے آدمی ہیں اور تم صرف ایک۔ ہمیں جتنے پانی کی ضرورت ہوگی............ لے لیں گے............ تم ہمیں نہیں روک سکتے............ ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔" تو کیا ہوتا؟ صرف یہی

کہ وہ شخص بددل ہو کر بیٹھ رہتا۔ کیونکہ جب اسے اپنی فاضل محنت کا کوئی پھل نہ ملتا اور دوسروں کے مسائل حل کرنے کے باوجود بھی اسے دوسروں ہی کی طرح زندگی بسر کرنے کے لئے صبح سے شام تک کام کرنا پڑتا تو اسے کیا غرض پڑی تھی کہ وہ نت نئی باتیں سوچتا۔ ایسی صورت میں معاشرے کی ترقی وہیں رک جاتی۔ زندگی اسی طرح گزرتی۔ ہر شخص صبح سے شام تک محنت کرتا اور صرف دو وقت کی روٹی کھاپاتا۔

تاہم ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ ننانوے آدمیوں نے اپنے سوویں ساتھی کو سوچ بچار سے نہیں روکا۔ اسی لئے معاشرے نے ترقی کی اور خوشحال ہوا۔ پھر ان کے بچے بڑے ہوئے اور انھوں نے سوچا کہ ان بچوں کو زندگی گزارنے کے گر سکھائے جائیں۔ یہ وہ دور ہے جب کہ معاشرے میں پیداوار بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کئی کام کرنے والے لوگوں کو ان کے کام سے ہٹا کر بچوں کی تعلیم پر مامور کر دیا جاتا ہے اور اس کے عوض انھیں اُجرت کے طور پر زندگی کی جملہ ضروریات فراہم کی جاتی ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ معاشرہ ذہین ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے سامنے فطرت کا حسن ظاہر ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ فطرت کے اس حسن اور جانوروں کو اپنی ڈرائنگ میں مقیّد کر لیتے ہیں۔ آرٹ کی ابتدا ہوتی ہے۔ فطرت کے وسیع و عریض اسٹوڈیو میں چڑیوں کی چہکار اور مختلف آوازوں کا حسن بعض لوگوں کو متاثر کرتا ہے...... موسیقی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنی پیداوار کے عوض تصاویر خریدتے اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یوں یہ پیش رفت جاری رہی۔ اس معاشرے کا ہر فرد اپنے کام کا کچھ حصہ دے کر اپنی ضروریات پوری کرتا رہا اور اس طرح ہر فرد دوسرے پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے لگا۔

اس معاشرے کی یہ ترقی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ بغض، حسد، نفرت اور غیر منصفانہ قوانین ایماندارانہ سرمایہ کاری کی راہ نہیں روکیں گے۔

بیٹے! میرا خیال ہے کہ اس کہانی سے یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہو گی کہ منافع کا مقصد ہرگز کسی کی جیب پر ڈاکہ ڈالنا یا کسی کا حق مارنا نہیں ہے۔ "

تھانیدار! "چور سے" پانچ منٹ کے اندر ہم تجھے آگ میں ڈال دیں گے بتا تیری آخری خواہش کیا ہے؟

چور! آگ بجھانے والے بلائے جائیں۔

مرسلہ راؤ محمد عاطف۔ کراچی

پاگل کون؟

مجھے آج اس ہسپتال میں تعینات ہوئے پہلا ہی دن تھا۔ لیکن میں ابھی تک اس وارڈ کا جائزہ نہیں لے سکا تھا جس کا مجھے چارج ملا تھا۔ یہ ہسپتال مکمل طور پر ایسے مریضوں کے لئے مخصوص تھا جو ذہنی طور پر پسماندہ تھے اور جنہیں ہمارا مہذب معاشرہ پاگل کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ میری سفارش پر ہی مجھے بچوں کے وارڈ کا انچارج مقرر کیا گیا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ بچوں کی نفسیات کو میں کافی حد تک سمجھ لوں گا۔ میرا پہلا ہی دن بہت مصروف تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے اور اترتے ہوئے مجھے تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے میں ہسپتال سے ملحقہ سبزہ زار پر آکر بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"تھکنا تو تھا ہی اگر میرا کہنا مان لیتے اور جوتوں میں پہیئے لگا لیتے تو کیوں تھکتے۔"

یہ اتنا عقلمندانہ مشورہ دینے والا بارہ تیرہ برس کا ایک بچہ تھا۔ میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور میں نے بظاہر تاسف بھرے لہجے میں کہا،

"مجھے افسوس ہے حضور والا! میں آپ کے اتنے قیمتی مشورے پر عمل نہیں کر سکا۔" اب بچے نے بغور میری جانب دیکھا اور یک لخت بندر کی سی پھرتی کے ساتھ سامنے نیم کے درخت پر چڑھ گیا۔ میں اس درخت کے قریب گیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا! "ارے یہ آپ کہاں چڑھ گئے؟"

"دیکھتے نہیں میں پپیتا ہوں۔"

اور میں دل ہی دل میں خدا کی شان کا قائل ہو گیا کہ اس نے نیم کے درخت میں پپیتا لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد بچے نے آہستہ آہستہ درخت سے اترنا شروع کر دیا اور یکدم پٹ سے زمین پر گر گیا۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا اس خیال سے کہ کہیں اسے چوٹ تو نہیں لگی۔ بچہ بالکل ساکت لیٹا تھا مگر اس کی گول گول آنکھیں ادھر سے ادھر حرکت کر رہی تھیں۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور آہستگی سے پوچھا، کیا ہوا پپیتے؟

جواباً اس نے نہایت راز دارانہ لہجے میں کہا! "میں نیچے گر کر پچک گیا ہوں۔"

میں ہنسنے لگا اتنے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کا پیغام آیا اور مجھے اوپر جانا پڑا۔ ایم ایس صاحب میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے نہایت شفقت سے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا اور گویا ہوئے۔ "میاں! تم نے بچوں کی ذمہ داری اپنے سر لے تو لی ہے لیکن اس کو نبھانا کافی مشکل ہو گا۔ بچے بہت زیادہ پیار اور توجہ مانگتے ہیں اور یہ بچے تو ویسے بھی عام بچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ حساس ہیں۔ اور ان کے بہت زیادہ حساس ہونے ہی نے اس کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں ان کو دیکھ کر اور ان سے مل کر بخوبی ہو سکے گا۔ لیکن تم ایک نیک جذبہ لے کر یہاں آئے ہو اس لئے اگر تم چاہو تو نہ صرف ان کو سمجھ سکتے ہو بلکہ انھیں معاشرے میں دوبارہ وہی مقام دلوانے میں ایک موثر کردار ادا کر سکتے ہو جو کہ ان کا بنیادی حق ہے۔ ان میں سے بعض بچے تو ایسے ہیں جن سے مل کر ہرگز یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان میں کوئی خرابی ہے۔ ان کی ذہانت، ان کی سمجھ بوجھ ہر شک سے بالاتر ہوتی ہے لیکن جہاں ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو گئی پھر ان بچوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ اس سلسلے میں ہماری بدقسمتی بھی رہی ہے کہ جتنے لوگ ان پر مقرر کئے گئے بچے ان سے مانوس تو کیا ہوتے مزید ان کے رویئے نے ان کو خوف کا شکار بنا دیا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تم ان تمام لوگوں سے مختلف ثابت ہو گے۔" انھوں نے پُر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

"جی ہاں اس سلسلے میں، میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی توقعات پر پورا اُتر سکوں۔ کیونکہ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ جو بچے حقیقی چاہتوں سے محروم رہ جاتے ہیں ان کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ضرور رہ جاتی ہے۔ ان کے کردار کی یا پھر شخصیت کی عمارت میں یہ بنیادی نقص رہ جاتا ہے اور پھر یہ نقص تا زندگی ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ آج ہمارا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ ان ذہنی مریضوں میں بچوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب اس مشینی دور میں والدین کے پاس بھی اپنے بچوں کو دینے کے لئے محبت کی کمی ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ معاشرے کا ناسور بن کر ہمارے سامنے ہیں۔ بہرحال میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ انھیں واپس ان کی دنیا میں بھیج دوں۔" یہ کہہ کر میں نے

اپنی بات ختم کی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دل بہت بوجھل ہو گیا تھا میں تنہائی میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا اس لئے واپس آ گیا اور اپنے باقاعدہ کام کا آغاز دوسرے دن سے کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے دن میں نے پر اعتماد قدموں کے ساتھ بچوں کے وارڈ میں قدم رکھا۔ جو پہلا منظر مجھے نظر آیا وہ یہ تھا کہ کل والا بچہ کھڑکی کی ریلنگ پر کھڑا چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہئے پپیتے صاحب کیا حال ہے؟"

"خبردار!" بچے نے مجھ پر گھونسہ تان لیا اور کہا! "تمہیں نظر نہیں آتا میں لیڈر ہوں۔"

"اچھی بات ہے مسٹر لیڈر، لیکن آپ اتنے اوپر چڑھے ہوئے کیا کر رہے ہیں نیچے تشریف لائیں۔"

"افوہ!" انھوں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر گویا ہماری کم عقلی کا ماتم کیا۔

"تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ کہ لیڈر لوگ ہمیشہ اونچی جگہ پر رہتے ہیں۔ نیچے تو عوام ہوتے ہیں۔" میں اس بچے کی ذہانت پر حیران رہ گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" بچے نے اپنا سلسلہ کلام جوڑا "آپ سب مجھے ووٹ دیں۔"

"تمہیں نہیں دیں گے۔" ایک بچے نے اپنا سر زور سے انکار میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں دیں گے۔" پہلا والا بچہ دھم سے نیچے آکودا اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم ڈٹو کو ووٹ دیں گے۔" جواب ملا۔

"ڈٹو کو...... لیکن وہ تو پاگل ہے۔" پہلے بچے نے تاسف بھرے لہجے میں کہا، جیسے ڈٹو کے پاگل ہونے پر اس کو بہت افسوس ہوا ہو۔

"ڈٹو کہتا ہے کہ اگر اسے ووٹ دیا گیا تو وہ ہمارے پلنگوں میں پہیئے لگا دے گا اور اسے کار بنا دے گا۔" دوسرے بچے نے گویا ڈٹو کا منشور بتایا۔

"اچھا...... تو ڈٹو اسے کار بنا دے گا۔ ارے جاؤ۔" پہلے بچے نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"تم لوگ مجھے ووٹ دو میں اسے ہوائی جہاز بنا دوں گا۔" اور پھر وہ ہاتھوں کی مدد سے ہوائی جہاز اڑانے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی تمام کے تمام بچے ہوائی جہاز اڑانے میں مشغول ہو گئے۔ میں تھوڑی دیر تک انھیں دیکھتا رہا اور پھر ان کے ہی انداز میں جہاز اڑانے لگا۔ نتیجتاً بچے رک گئے اور غور سے مجھے

دیکھنے لگے۔ جواباً میں بچوں کو ان سے بھی زیادہ غور سے دیکھنے لگا اور کھڑا الووں کی طرح آنکھیں جھپکاتا رہا۔ یہ دیکھ کر بچے میرے گرد زور زور سے گھومنے لگے تو میں نے اس سے بھی زیادہ شدومد سے چکر پھیریاں کاٹنی شروع کر دیں۔ اب تمام بچے رک گئے اور ایک بچہ جو ان میں ذرا لمبا سا تھا، ہاتھوں کی مدد سے ان کو سمجھاتے ہوئے بولا ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے یہ بالکل پاگل ہے۔''

اور مجھے اپنی کھوپڑی چاروں طرف ناچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ ایک طرح سے ان بچوں سے میری دوستی کا آغاز بھی تھا۔

بچّے چاہے کسی قوم، کسی طبقے، کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ محبت اور توجہ پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب سے میں یہاں آیا تھا کوئی اِکّا دُکّا واقعات ہی ہوئے تھے جو ان بچوں کو غیر صحت مند قرار دیتے تھے۔ لیکن وہ واقعہ بلاشبہ میری کامیابی کی سب سے بڑی دلیل بن گیا۔ اس روز میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ کچھ دواؤں کی خریداری کے سلسلے میں بازار گیا ہوا تھا۔ واپس آنے تک رات کا وقت ہو چلا تھا۔ جیسے ہی میں اپنے وارڈ کی طرف مڑا وہاں سے آنے والی بے ساختہ چیخوں نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ میں تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کے اندر جو دل سوز منظر میں نے دیکھا وہ کم از کم میری توقع کے خلاف تھا۔ عملے کے کم و بیش تمام افراد وہاں موجود تھے اور میرے ہی وارڈ کے ایک بچے طاہر کو رسیوں سے بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بچہ بُری طرح مچل رہا تھا اور کسی طرح نہیں سنبھل رہا تھا۔ میں نے تقریباً چیختے ہوئے وہاں موجود تمام لوگوں سے واپس جانے کو کہا تو وارڈن صاحب میرے قریب آگئے اور قدرے درشت لہجے میں کہا کہ ''تمہیں نہیں معلوم یہ اب بہت خطرناک ہو گیا ہے اور اس کا اب یہی ایک حل ہے۔''

''یعنی مار پیٹ؟'' میں نے افسوس ناک لہجے میں پوچھا۔

بچے کے چہرے پر انگلیوں کے نشانات ابھر آئے تھے۔ رسیوں سے اس بُری طرح باندھا گیا تھا کہ اس کی رگیں تک پھول گئی تھیں اس سنگدلی کو دیکھ کر غصے کے مارے میرا برا حال تھا۔ ایسا سلوک تو کوئی جانوروں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھتا یہ تو پھر بھی ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔

''آپ لوگ برائے مہربانی یہاں سے چلے جائیں۔'' میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں وارڈن صاحب نے کندھے اچکائے اور ایک ایک کر کے سب باہر نکل گئے۔ بچہ اب بھی بری طرح چیخ رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور نرمی سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ حیرت انگیز طور پر بچے نے مچلنا چھوڑ دیا، لیکن وہ چیخ اب بھی رہا تھا اب میں نے آہستہ آہستہ اس کی رسیوں کو کھولنا

شروع کر دیا اور پھر میں نے اس کو مخاطب کیا "طاہر! کیا ہوا آپ کو؟" جواب میں طاہر مجھے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ وہ اب خاموش ہو گیا تھا۔ میں کافی دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ نتیجتاً بچہ گہری نیند سو گیا۔

میری اس کامیابی نے تمام عملے کو متاثر کیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ جب بھی کسی کو اس قسم کے دورے پڑتے تو اس وقت تو اس کا علاج اسی طرح باندھ کر مار پیٹ سے کیا جاتا اور بعد میں اسے ہفتوں سکون آور ادویات کے تحت رکھا جاتا۔

بعد میں بھی دو تین اسی طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ کبھی طارق، کبھی حنیف اور کبھی سلام اپنی خامیوں کا اظہار کرتے رہے۔ لیکن اب مجھے ان بچوں کو سنبھالنے میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ یہ بچے مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ میں ان بچوں کو تاریخ کے نامور رہنماؤں کی کہانیاں سناتا رہتا تھا۔ جس سے وہ بچے اثر لیتے تھے اور ان کی باتوں کو اپنی زندگیوں پر لاگو کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور یہی اس بات کی سب سے بڑی دلیل تھی کہ ان بچوں کی ذرا تربیت اور توجہ انھیں صحت مند بچوں کی صف میں لا کھڑا کر سکتی ہے جب کبھی ان بچوں کے مابین لڑائی ہوتی تو ان کے درمیان کچھ اس طرح کے مکالمے ہوتے۔

"تم پکے میر صادق ہو۔"

اور میں بغیر کسی توقف کے سمجھ لیتا کہ یہ اثر ٹیپو سلطان کے واقعے کا ہے۔ اور بعض دفعہ تو بچوں میں اس بات پر گھمسان کا رن پڑ جاتا کہ ان میں سے کون ٹیپو سلطان ہے اور کون میر صادق؟ نتیجتاً اس جنگ کو روکنے کے لئے مجھے میدان میں کودنا اور کہنا پڑتا کہ چلو اگر عارف ٹیپو سلطان ہے تو طاہر راشد منہاس۔"یہ کون ہے؟" طاہر لال بھبو کا چہرے کے ساتھ پوچھتا۔

بھئی اگر ٹیپو سلطان پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہیرو تھا تو راشد منہاس پورے پاکستان کا ہیرو ہے۔ اور پھر بچوں کا موڈ دیکھتے ہوئے مجھے اپنے تمام کام چھوڑ کر بتانا پڑتا کہ راشد منہاس کون ہیں اور کیا کارنامہ انھوں نے سرانجام دیا کہ زندہ جاوید ہوئے۔ تمام بچے نہایت خاموشی سے تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ میری بات سنتے۔ اس حالت میں کوئی میرے کاندھوں کے ساتھ لٹک رہا ہوتا، کوئی گھٹنوں کے ساتھ بیٹھا ہوتا، دو چار گود میں چڑھنے کی کوشش کرتے۔ ان بچوں کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دن اتنے خوبصورت اور یادگار تھے کہ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ان یادوں کو اپنے ذہن سے کھرچنا محال ہے۔ اور نہ ہی اس دن کو بھلا سکوں گا جو میری زندگی کا پچھتاوا بن گیا۔

اس دن صبح ہی سے تیاریاں ہو رہی تھیں کیونکہ میں نے بچوں کو کسی تفریحی مقام پر لے جانے کی

اجازت حاصل کر لی تھی۔ ایسا بہت ہی کم ہوا تھا کہ بچّے اس ادارے سے گھومنے پھرنے کی غرض سے باہر نکلے ہوں۔ لہٰذا قدرتی طور پر وہ سارے بھی پُر جوش تھے۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی جس بچے کی سمجھ میں جیسے آیا وہ اسی طرح تیار ہو گیا۔

ہم جب پارک پہنچے تو دھوپ کسی حد تک ڈھل چکی تھی۔ اور پارک میں بے انتہا چہل پہل تھی۔ تمام بچے پارک میں آتے ہی کھیل کود میں مگن ہو گئے۔ ہر بچے کے اس موقع پر احساسات مختلف تھے۔ کچھ بچے حیرت سے چلتے پھرتے ہوئے لوگوں، کھیلتے کودتے تندرست و توانا بچوں اور خوبصورت پارک کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ بچے پارک سے باہر کی سڑک پر دیوہیکل گاڑیوں کو آتے جاتے حیرت سے تک رہے تھے اور پارک میں موجود بچوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کر رہے تھے انھیں دیکھ کر قلقاریاں مار رہے تھے۔ ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اور جواباً انھیں وہ گرمجوشی نظر نہیں آ رہی تھی جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔ پارک میں موجود بیشتر لوگ اس طرح کے ردعمل کا مظاہرہ کر رہے تھے جیسے کہ وہ بچے اچھوت ہوں اور ان کی طرف دیکھنے سے ہی ان کے بھی بچے اس موذی مرض کا شکار ہو جائیں گے۔ کئی ایک نے تو واضح طور پر ان بچوں کو جھڑک دیا ہر فرد مڑ مڑ کر انھیں اس طرح سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔ انگلیوں سے اشارہ کر رہے تھے کہ دیکھو یہ کیسے پاگل ہیں۔

لوگوں کے دل شکن رویئے سے بچوں میں وہ جوش وہ خروش باقی نہیں رہا جس کا مظاہرہ وہ پہلے کر رہے تھے۔ اور میں شدت سے اس بات کو سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہمارے معاشرے میں رہنے والوں کا رویہ انھیں کبھی ٹھیک نہیں ہونے دے گا۔ اور اگر وہ ٹھیک ہو کر واپس ان کی دنیا میں لوٹ بھی جاتے ہیں تو وہ کبھی بھی اطمینان بخش زندگی نہیں گزار پاتے۔ انھیں ہمیشہ ان کے ماضی کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا پاگل پن ان کی زندگیوں کے لئے گناہ عظیم بن جاتا ہے لیکن کبھی کوئی یہ نہیں سوچتا کہ انھیں اس حال تک پہنچانے میں ان کا اپنا کتنا حصہ ہے۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر یہ سوچ رہا تھا اور بچے لوگوں کے رویئے سے مایوس ہو کر آپس ہی میں کھیل کود رہے تھے کہ چشم زدن میں وہ واقعہ پیش آ گیا۔ ہر فرد گنگ رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بچہ کسی لمحہ اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر سڑک پر بھاگا اور تیزی سے آتے ہوئے آئل ٹینکر کے سامنے آ گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تیزی سے میرے سامنے سے ہو کر طارق بھاگا۔ اور جب حواس بحال ہوئے تو ایک طرف بچہ صحیح و سلامت پڑا ہوا تھا اور دوسری طرف اپنے ہی خون میں ڈوبا ہوا بے جان طارق تھا۔ آئل ٹینکر اسے روندتے ہوئے گزر گیا تھا۔

آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میں طارق کو نہیں بھلا سکا۔ سوچتا ہوں کہ واقعی وہ پاگل ہی تو تھا ورنہ کسی ماں کے لعل کو بچانے کے لئے اپنی جان کیوں گنواتا۔

1
مرجانہ کی جلدبازی
ترجمہ: کاشف طاھر "سعودیہ"
یہ عدسہ بھی اچھا تو ہے ....
مگر زیادہ طاقتور عدسہ خریدنا اچھا رہے گا
ہاں! ... یہ بہت اچھا خیال ہے ..
اور مرجانہ نے اپنے کیمرے کے لئے ایک طاقتور عدسہ خریدا
اب میں اسے اپنے کیمرے میں فِٹ کردیتی ہوں۔

2
واہ... ہر چیز بڑی نظر آرہی ہے۔ واقعی نئی ایجادات انسان کی کتنی مدد کرتی ہیں۔
یہ کام تو ہوگیا ــ اب ایک کپ اورنج جوس پی لینا چاہیئے
تصویریں کھینچنا تو کوئی مجھ سے سیکھے
مجھ سے بہتر فوٹوگرافر تو دُنیا میں موجود ہی نہیں۔
میری دوست کہتی ہیں کہ میں واقعی مرجانہ ہوں - یعنی اپنا کام بہت لگن سے کرتی ہوں - عنقریب میں تصویروں کی دُنیا میں بھی انہیں اپنی ذہانت کا قائل کرلوں گی۔

کچھ تصویریں کھینچ کر دیکھوں کہ نیا عدسہ کیسا ہے
کیا خوبصورت تصویر ہے !
ارے یہ کیا ! ایک زہریلا کیڑا !!
میں نے ایک نیا کیڑا دریافت کرلیا۔ بالکل نیا۔۔
ہیلو۔۔ یس ۔۔۔ میں نے ایک نادر کیڑا دریافت کیا کیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے علاقے میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں۔ آپ اپنے ماہرین کو فوراً یہاں بھیجیے فوراً !!!
ریسرچ ٹیم کو بلانے کے بعد مرجانہ نے جب اپنا کیمرہ اُٹھا کر دیکھا تو اس میں ایک شہد سے لتھڑی ہوئی مکھی چپکی ہوئی تھی
یا خدا ! یہ میں نے کیا کر دیا۔ سب لوگوں کو جلدی جلدی اطلاع دے دی۔ ریسرچ والوں کو اب کیا کہوں گی۔ اور میری سہیلیاں بھی میری بے وقوفی پر میرا مذاق اُڑائیں گی۔ واقعی جلد بازی کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے

ٹامی زندہ ہے

طاہر مسعود

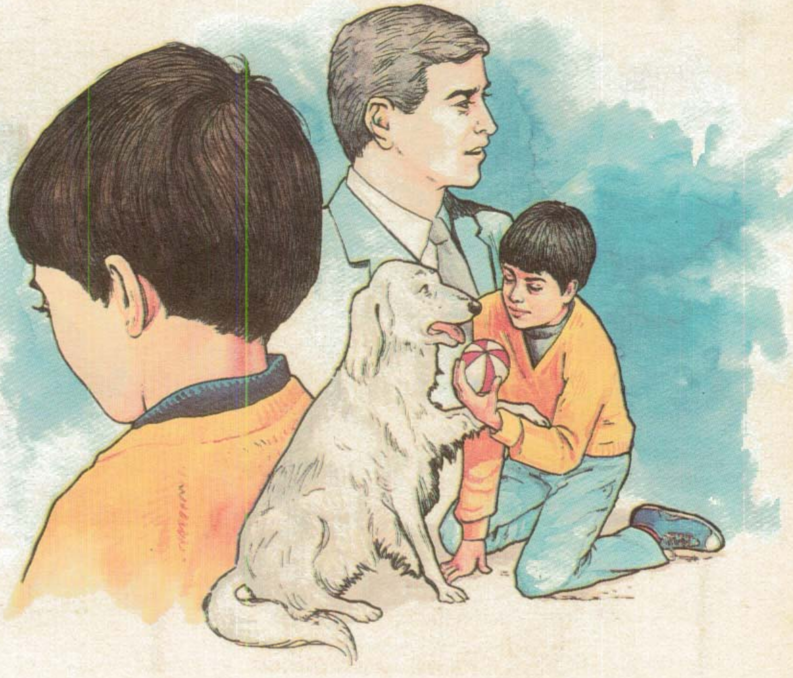

فلیٹ کی ریلنگ سے جھک کر عارف نے دیکھا۔ سمندر کا گہرا سیاہ پانی ہلکورے لے رہا تھا اور سطح پر دن بھر کے تھکے ماندے سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں۔ پرندوں کی ڈار کہیں دور سے اڑتی چلی آ رہی تھی۔ ساحل پر آج گہما گہمی نہیں تھی۔ دو ایک گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں بیٹھے ہوئے لوگ وہیں سے سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ عارف انھیں دیکھ کے ہاتھ ہلانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ جواب میں وہ بھی اپنے ہاتھ ہلائیں گے۔ لیکن گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ ان کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہاتھ ہلاتے ہلاتے تھک گیا اور مایوس ہو گیا۔ اور ایسا تو روزانہ ہی ہوتا تھا۔ جب تک ٹامی نہیں آیا تھا اس فلیٹ میں وہ اپنے آپ کو اکیلا پاتا تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی بھی تو نہیں تھا۔ پھر ایک

دن پاپا اپنے ساتھ ٹامی کو لے کے آ گئے۔ لمبے لمبے کانوں اور بھرے ہوئے بالوں والا ٹامی۔ اسے دیکھ کر غرّایا جیسے کہہ رہا ہو "خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا" لیکن پھر عارف نے گوشت اور ہڈیوں سے اس کی تواضع کی تو مانوس ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ اب آئندہ اسی لڑکے کا ساتھ ہے۔ اگلی صبح غذا پر منہ مارنے سے پہلے ٹامی نے اپنے دوست کے آگے سر جھکا دیا عارف نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور یوں دونوں میں دوستی ہو گئی۔ عارف فلیٹ کی ریلنگ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ ممی اور پاپا ابھی تک دفتر سے لوٹے نہیں تھے اور ٹامی بیمار تھا۔ سستی سے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ عارف نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ آدمی بھی بیمار پڑتے ہیں تو اسی طرح پڑ جاتے ہیں ٹامی آدمی نہ سہی مگر جاندار تو تھا۔ ٹامی بھلا چنگا ہوتا تو وہ اس کو ساتھ لے کر ساحل پر چلا جاتا۔ جہاں دونوں ساحل کی گیلی ریت پر دوڑ لگایا کرتے تھے۔ ٹامی بہت تیز بھاگتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ اپنے دوست کے قدموں سے لپٹ جاتا، اپنا منہ اس کی قمیص سے رگڑتا اور پھر بھونکتا ہوا ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوتا جس کا مطلب ہوتا تھا "آؤ مجھے پکڑو۔" دونوں دوست کھیلتے کھیلتے تھک جاتے تھے تو وہیں ریت پر پڑ کر سستانے لگتے تھے۔ ٹامی کی موجودگی کے باوجود عارف کو ایک ایسے دوست کی بے انتہا کمی محسوس ہوتی تھی جس سے وہ باتیں کرے۔ اسکول کی کتابوں کی اور کہانیوں کی۔ اس کے سارے دوست یہاں سے دور رہتے تھے۔ عمارت کے بقیہ فلیٹوں میں اس کا کوئی بھی ہم عمر نہیں تھا سب بڑی عمروں کے لوگ رہتے تھے جو اسے دور ہی سے "وش" کر کے آگے بڑھ جاتے تھے۔ ممی اور پاپا صبح سویرے آفس چلے جاتے تھے اور اس کے اسکول سے لوٹنے کے بہت دیر بعد واپس آتے تھے اور اتنے تھکے ہوئے ہوتے تھے کہ بس رسماً ہی چند ادھر ادھر کی باتیں کر پاتے تھے۔ پھر وہ ہوم ورک کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی تھی۔ اور ممی اسے اگلی صبح بستر سے اٹھنے کا کہہ کر سلا دیا کرتی تھیں۔ یہ کتنی بور زندگی تھی۔ اسی لئے جب سے ٹامی آیا تھا اسے ایک دوست مل گیا تھا جس سے وہ اسی طرح باتیں کیا کرتا تھا جیسے کوئی اپنے دوست سے کرتا ہے۔

"پتا ہے ٹامی۔ آج اسکول میں بہت مزہ آیا۔ انگلش کی مس مارتھا نے پوچھا تم میں سے کس کو "ایلس ان ونڈر لینڈ" کی کہانی یاد ہے۔ میں نے ہاتھ اٹھایا...... ارے تم سن رہے ہو نا۔ یہ تمہارے کان اتنے بڑے بڑے کیوں ہیں۔ ٹامی بولو...... او، آئی ایم سوری۔ تم بول کہاں سکتے ہو۔" وہ اسی طرح نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہتا تھا۔ اور ٹامی بھی مزے میں سنتا رہتا تھا۔ شاید سمجھتا بھی ہو۔

عارف کو چھٹی کے دن خوب مزہ آتا تھا اس لئے کہ اس دن وہ سب کہیں نہ کہیں سیر کے لئے نکلتے تھے ٹامی بھی ساتھ رہتا تھا۔ پاپا تو ممی سے ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ البتہ ممی کبھی اس کے کالر ٹھیک کر دیتی تھیں، کبھی قمیص پر پڑی ہوئی گرد یا داغ دھبہ صاف کر دیتی تھیں۔ عارف چڑ جاتا تھا۔ ممی کو تو بس

کپڑوں کی صفائی کی ہی پڑی رہتی ہے۔ پھر بھی اسے چھٹی کا دن پسند تھا اس لئے کہ اسے گھر کی فضا سے باہر نکلنے کا موقع ملتا تھا۔

ابھی تک ممی اور ڈیڈی دفتر سے واپس نہیں آئے تھے۔ ملازمہ کچن میں شام کی چائے بنانے میں مصروف تھی۔ عارف کو یکایک ٹامی کا خیال آیا۔ جنگلے کے پاس پہنچ کر اس نے جھا نکا تو اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ ٹامی فرش پر سیدھا پنجوں کے بل لیٹا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں اور سانس زور زور سے چل رہی تھی۔

"ٹامی" اس نے پکارا۔ اس کی آواز سن کے ٹامی نے آنکھیں کھول دیں۔

"ٹامی، تم کیسے ہو۔" عارف نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں مردنی سی چھائی ہوئی تھی اور اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ظاہر سی بات ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن اس کی حالت اتنی خراب ہوگی اس کا تو اسے اندازہ بھی نہ تھا۔ عارف کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی کیا مدد کرے۔ لیکن اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے تھا، آخر کو وہ اس کا دوست تھا۔ اسے یاد آیا ایک مرتبہ اسے ملیریا ہو گیا تھا تو ٹامی اس کے بستر کے قریب بیٹھا اسے دیکھتا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ باہر جاتا لیکن گھوم پھر کے واپس اپنی جگہ پر لوٹ آتا۔ عارف جب تک بیمار رہا، ٹامی مضطرب دکھائی دیتا رہا۔ اور جس دن وہ صحت یاب ہو کر اٹھا تو اس کے دوست نے مسرت سے اپنے سر کو اس کی ٹانگوں پر کئی بار رگڑا۔ عارف کو ایسے ہی کئی اور واقعات یاد آئے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ ٹامی کے بیمار پڑنے سے وہ بیکار ہو کر رہ گیا تھا۔ بالکل بیکار اور اکیلا۔ وہ جنگلے کے پاس بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ پاپا اور ممی آگئے تھے لیکن عارف آج نیچے کی طرف نہیں بھاگا۔ وہ وہیں آلتی پالتی مارے ٹامی کو دیکھتا رہا۔

"ہیلو مائی سن۔" عقب سے پاپا کی آواز آئی۔ ممی کی نرم نرم ہتھیلیوں کی گرفت اسے اپنے کندھوں پر محسوس ہوئی۔ انھوں نے جھک کر باری باری اس کے ماتھے پر پیار دیا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ یہ بھی نہیں کہ عارف تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ ٹامی کیسا ہے اس کی سانس اتنے زور سے کیوں چل رہی ہے۔ بس ان کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ ٹامی نے اپنی آنکھیں کھول کے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے دوست کی طرف جو اداس بیٹھا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ وہ پاپا اور ممی کے ساتھ چائے میں شریک نہیں ہو گا اور ان سے بالکل بھی نہیں بولے گا۔ ٹامی کے اس طرح دیکھنے پر اس نے جنگلے سے ہاتھ بڑھایا اور اس کے بالوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ ٹامی کو اطمینان کا احساس ہوا اور اس نے آنکھیں موند لیں تھوڑی ہی دیر میں اسے پاپا کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہے تھے۔ اس نے سوچا وہ وہیں بیٹھا رہے یا چلا کر کہہ دے۔ "میں نہیں آؤں گا۔ میں نہیں آؤں گا۔" مگر وہ ایسا بچہ

نہیں تھا اس نے ٹامی پر ایک نگاہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ممی اور پاپا آمنے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور باتیں کئے جا رہے تھے۔ ان کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ انہوں نے روز کی طرح عارف کو عادتاً آواز دی تھی اور اب تک اپنے بیٹے کی ناراضگی کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر ممی نے کہا "آؤ بیٹے۔ دیکھو ہم تمہارے لئے پائن ایپل کا کیسا شاندار کیک لائے ہیں۔" عارف نے دیکھا میز کے بیچ میں رنگین ڈبے میں ایک بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا، سفید سفید کریم میں لپٹا ہوا جسے چھری سے کاٹو تو اندر سے اناناس کے پیلے پیلے ٹکڑے نکلتے تھے جو منہ میں جاتے ہی رس گھول دیتے تھے۔ وہ اس کیک پر جان دیتا تھا لیکن آج اس نے کیک کو ایسے دیکھا جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔ ممی اس کی کیفیت کو بھانپ گئیں۔

"کیا بات ہے بیٹے۔ تم اتنے ڈیپرس کیوں ہو؟" انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" پاپا نے کہا۔

"یس پاپا۔" اس نے سر جھکا کے نیچی آواز میں کہا۔

"ٹامی تو ٹھیک ہے؟" اچانک ممی کو یاد آیا جب وہ داخل ہوئی تھیں تو عارف وہیں ٹامی کے پاس بیٹھا تھا اور انھوں نے جلدی میں خیال نہیں کیا تھا۔

"وہ بیمار ہے۔ میں نے کل بھی بتایا تھا۔" اس نے کہا۔

"کم ان عارف۔" ممی نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہم اسے فرائی ڈے کو لے چلیں گے ڈاکٹر کے پاس چلو غصہ تھوک دو۔"

"فرائی ڈے کو۔" اس نے کہا اور پھر دل ہی دل میں حساب لگایا۔ ابھی فرائی ڈے میں پانچ دن پڑے تھے اور اتنے دنوں میں تو ٹامی کی حالت بگڑ جائے گی۔

بات یہ تھی کہ پاپا اور ممی کو ٹامی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو ان کے ایک دوست نے آسٹریلیا منتقل ہوتے ہوئے ٹامی کی زنجیر ان کے ہاتھوں میں تھما دی تھی اور وہ عارف کے خیال سے وہاں اسے لے آئے تھے۔ ورنہ ان کے پاس ٹامی کو پالنے کی فرصت کہاں تھی۔

"اتنے دن میں تو ٹامی مر جائے گا ممّی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں بیٹے تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ پھر دیکھو نا ہمارے پاس اس سے پہلے وقت ہی کہاں ہے۔" ممی نے سمجھایا۔

"ممّی آج ہی چلئے نا۔ اسے ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"فضول کی ضد مت کرو بیٹے۔ ہم اسے لے چلیں گے ڈاکٹر کے پاس۔ کہہ دیا نا۔" پاپا نے تیزی سے کہا۔ وہ کچھ دنوں سے دیکھ رہے تھے کہ عارف میں اپنی بات منوانے کی عادت پیدا ہوتی جا رہی

تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ادھر بات منہ سے نکلے اور اُدھر پوری ہو جائے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ پاپا کا موڈ دیکھ کر اس کو کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بے دلی سے کیک کا ٹکڑا لئے ریلنگ کی طرف آ گیا۔ سمندر کا پانی اور سیاہ ہو گیا تھا۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے ہوا کے تیز جھونکوں سے اس کے بال اڑنے لگے۔ آسمان کا رنگ بھی بدلتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیسے اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ بارش آنے والی ہے۔

رات کو وہ ہوم ورک کرنے بیٹھا تو پڑھنے میں اس کا بالکل جی نہیں لگا۔ وہ بس کاپی پر آڑھی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔ ممی اور پاپا کے رویئے سے اس کا دل بجھ گیا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا جا کے ٹامی کو دیکھے وہ کس حال میں ہے۔ لیکن پھر غصے میں اس نے ارادہ بدل دیا۔ کھانے کی میز پر سے بھی وہ جلدی ہی اٹھ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے ٹامی کا ستا ہوا چہرہ، اس کی نیم وا آنکھیں، اس کا ست وجود ناچتا رہا۔ پھر کسی لمحے اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہی ہوا، رات کے کسی پہر بادل کی خونخوار گرج اور بجلی کی زور دار کڑک کے ساتھ دریچوں کے پردے ہوا میں اڑنے لگے۔ عارف کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا پاپا اٹھ کر دریچوں کے پٹ بند کر رہے ہیں۔ پھر وہ چادر اوڑھ کر سو گئے۔ مگر عارف کو نیند نہیں آئی۔ یکایک بجلی خوب زور سے کڑکی اور کمرہ تاریک ہو گیا بلب کے بجھتے ہی عارف کو ٹامی کا خیال آیا وہ دبے پاؤں اٹھا، میز کی نچلی دراز سے ٹارچ نکالی اور دیوار کا سہارا لے کر چلتا ہوا ٹامی کے جنگلے تک پہنچا۔ ٹارچ کی روشنی جیسے ہی ٹامی پر پڑی، عارف کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ٹامی کا بے جان جسم فرش پر پڑا تھا، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ...... کتنی بے نور تھی اس کی آنکھیں، زندگی کی چمک سے محروم، اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ "ٹامی مر چکا ہے۔" یہی ایک خیال اس کے ذہن میں سنسنا رہا تھا۔ اس کی چیخ سن کر پاپا اور ممی جاگ چکے تھے اور اس کا نام لے کر پکارتے ہوئے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔

اگلی صبح بے حد غمناک تھی۔ آسمان دُھل دُھلا کر صاف ہو گیا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ نیلا نظر آ رہا تھا۔ ساحل پر سفید سفید پرندوں کے غول جمع تھے۔ پاپا سویرے ہی اٹھ گئے تھے اور عارف کو تو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اسے رونا بھی نہیں آیا تھا۔ پاپا پھاؤڑا لئے فلیٹ کے پیچھے خالی میدان میں ٹامی کی قبر کے لئے کوئی مناسب سی جگہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ جنگلی گھاس اور خود رو پھولوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جگہ کو انھوں نے چنا۔ اسے صاف کیا اور تھوڑی دیر کی محنت کے بعد ٹامی کی جسامت کے لحاظ سے گڑھا کھود ڈالا۔ پھر دونوں باپ بیٹے ٹامی کو اٹھا کر وہاں تک لائے اور گڑھے میں اس کے مردہ جسم کو رکھ کر مٹی ڈالتے رہے۔ کام ختم کرنے کے بعد پاپا جب چلنے کے لئے پلٹے تو ان کی نظر عارف پر پڑی جو سکتے کے عالم میں قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ اب تک انھوں نے اپنے بیٹے سے نظر نہیں ملائی

تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہے تھے۔

"آئی ایم سوری۔" پاپا نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

اس نے سر اٹھا کر پاپا کی طرف عجیب بے چارگی سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تب پتا نہیں کیوں اور کیسے پاپا کو لگا کہ ان کا اکلوتا بیٹا اب اس دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔ یہ احساس ان کے لئے تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے ایک دم کھینچ کر عارف کو اپنے سینے سے چمٹالیا

"رو نہیں بیٹے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" انہوں نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ عارف کو محسوس ہوا وہ اکیلا نہیں ہے۔

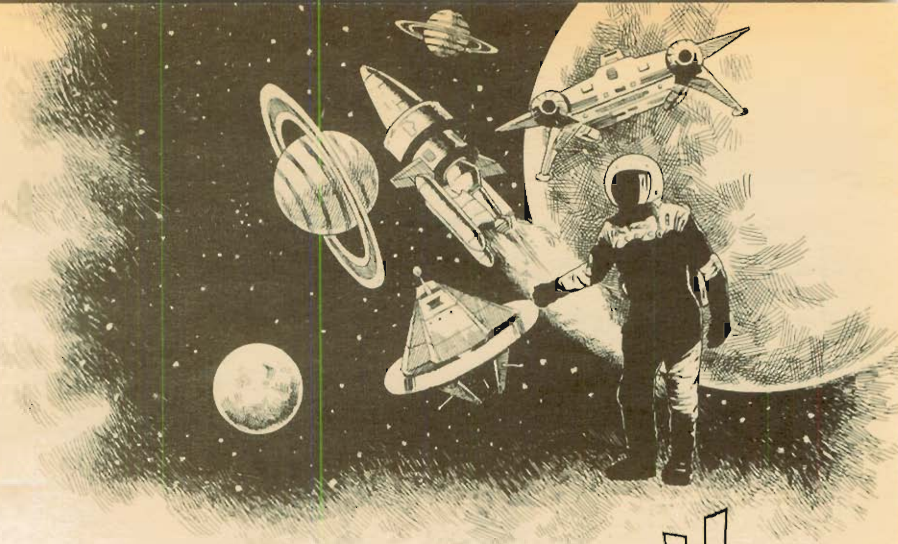

خلا

امن کا پیغامبر

آپ نے ''خلا'' کا لفظ اکثر سنا ہو گا۔ لیکن آپ نے غور کیا ہے کہ خلا کی حقیقت کیا ہے؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

محمد کاشف قریشی

قصہ یہ ہے کہ ہماری زمین کے چاروں طرف آکسیجن، نائٹروجن اور دوسری گیسوں پر مشتمل ہوا کا ایک بہت بڑا غلاف لپٹا ہوا ہے۔ جسے ہوائی کرہ کہتے ہیں۔ ہوائی کرہ ہمیں سورج سے آنے والی خطرناک بنفشی شعاعوں اور کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہ ایک خاص قدرتی پردہ ہے جس میں سے سورج کی توانائی چھن چھن کر زمین تک آتی ہے۔ یہ ہوا کا غلاف ہی ہے جو سورج کی روشنی کو خاص انداز سے منتشر کرتا ہے۔ اسی غلاف کی بدولت ہمیں آسمان دن کے وقت نیلگوں نظر آتا ہے۔

جب ہم زمین سے کئی سو کلو میٹر اوپر پہنچ جاتے ہیں تو وہاں ہوائی کرہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں ہوا نہیں ہوتی، گیسوں کے چند سالمے (Molecules) اگر ہوتے بھی ہیں تو ایک دوسرے سے بہت زیادہ دور ہوتے ہیں۔ ایسی جگہ کو خلا (Space) کہتے ہیں۔

خلا کی تشریح تو یہ ہے کہ جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ہوا بھی نہیں ہوتی کیونکہ خلا کے معنی ہیں ''خالی جگہ'' مگر بعض سائنس دان جو خلا کو خالی خیال نہیں کرتے ہیں کہتے ہیں کہ

"کائنات میں خلا محال ہے۔ جہاں کچھ نظر نہیں آتا وہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ جہاں مادے کے ذرے ٹھوس ہو کر مل جاتے ہیں وہ خلا نہیں ہے اور جہاں گیس کی صورت میں پھیلے ہوئے ہونگے وہاں ہم خلا سمجھتے ہیں۔ جیسے ہمارے ارد گرد کی ہوا جو ہمیں نظر نہیں آتی۔"

یہ تو تھی طبیعات (Physics) کی بات اب ذرا ایک ماہر فلکیات کی بات بھی سنئے۔ سر جیمز جینز نے دور بینوں کی مدد سے ستاروں کا گہرا مشاہدہ کیا وہ کہتے ہیں کہ

"کائنات میں اتنے ستارے ہیں کہ انہیں گنا نہیں جاسکتا۔ ستاروں کے کروڑوں جھرمٹ ہیں اور ہر جھرمٹ میں کروڑوں ستارے ہیں۔ جہاں ہم ابھی اتنی دور نہیں دیکھ پاتے جسے کائنات کی آخری حد کہا جائے۔ اس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کائنات تقریباً خالی ہے۔ یعنی کائنات اتنی وسیع ہے کہ اربوں کھربوں ستارے، سیارے اس کے ذرا سے کونے میں سما سکتے ہیں۔"

سر جیمز جینز نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ ستاروں کے جس جھرمٹ میں ہماری زمین واقع ہے اس میں سورج سے بھی کوئی دس گناہ بڑے کروڑوں ستارے ہیں لیکن خود کائنات اتنی وسیع ہے کہ یہ دس کروڑ ستارے گویا اس کے مقابلے میں دس کروڑ خاک کے ذروں کے برابر ہیں۔ تو پھر کائنات میں خلا نہیں ہے تو کیا ہے۔ اسی لئے ستاروں کے آپس میں ٹکرانے کا امکان بہت کم ہے۔ مثلاً زمین اور چاند کے درمیان کئی لاکھ کلو میٹر کی جگہ میں اور زمین سے سورج کے بیچ میں کروڑوں کلو میٹر تک بس خلا ہے۔

جب ہم ہوا کے غلاف سے باہر نکل کر خلا میں قدم رکھتے ہیں تو ہم ایک نرالی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں نہ ہوا ہے نہ پانی نہ کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ وہاں پر آپ ہر وقت راکٹ میں تیز رفتاری سے حرکت کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر حرکت نہ کریں گے تو کسی بھی سیارے سے ٹکرا جائیں گے۔ خلا ہمیشہ سے سنسان اور خاموش ہے۔ وہاں پر آپ کو اپنی ہی آواز سنائی نہیں دے گی۔ کیونکہ آواز کی لہریں خلا میں سفر نہیں کرتیں۔ خلا زمین سے یکسر مختلف ہے۔ خلا میں نہ دن ہوتے ہیں نہ رات۔ آسمان نیلا نہیں رہتا، سیاہ اور تاریک ہو جاتا ہے۔ سورج اور ستارے سب ایک ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہاں سورج کی روشنی بہت تیز ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ستارے ماند نہیں پڑتے۔ خلا میں ستارے جھلملاتے بھی نہیں ہیں بلکہ بڑی تعداد میں چمکتے ہیں۔ خلا کا کوئی موسم نہیں ہوتا وہاں سردی، گرمی کا کوئی ایسا معاملہ نہیں ہوتا جیسا کہ زمین پر ہوتا ہے۔ مشاہدہ ہے کہ جیسے جیسے ہم ہوا کے غلاف سے باہر ہوتے ہیں سردی بڑھنے لگتی ہے۔ خلا میں پہنچ کر جس جگہ سورج کی شعاعیں براہ راست پڑتی ہیں وہ جگہ گرم اور جس جگہ سورج کی شعاعیں براہ راست نہ پڑ رہی ہوں وہ جگہ سرد ہوتی ہے۔

زمین کی عظیم کشش پر قابو پا کر انسان بردار خلائی جہاز (Space Air Craft) کو راکٹ انجنوں کی مدد سے ہوائی کرے کو چیرتے ہوئے خلا میں لے جانا اور پھر واپس حفاظت کے ساتھ زمین پر لے آنا جدید سائنس کا ایسا بے مثال کارنامہ ہے جو بیسویں صدی سے پہلے ناممکن تھا۔ مگر اب انسان خلا میں چہل قدمی کر رہا ہے۔ آیئے ہم آپ کو خلا میں چہل قدمی سے متعلق کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

پراسرار خلا میں چہل قدمی کے لئے خاص دباؤ والے خلائی سوٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ جسم کے اندرونی اعضاء پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ خلا میں سیر بہت ہی عجیب و غریب پرلطف اور حیرت انگیز ہے۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خلا میں چیزیں اپنا وزن کھو دیتی ہیں۔ اور ادھر ادھر تیرنے لگتی ہیں۔ "دراصل وزن وہ قوت ہے جس سے زمین کسی بھی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔" یہ کشش ثقل کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز کسی خاص سمت میں تیزی سے جانے لگے تو طبیعاتی قانون کے مطابق اس چیز کے وزن میں کسی خاص سمت میں جانے والی رفتار بھی شامل ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا وزن تیزی سے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ آج کل تیز رفتار لڑاکا طیارہ جب تیزی سے لڑتے ہوئے مڑتے ہیں یا تیزی سے غوطہ لگاتے ہیں تو پائلٹوں کو اپنے وزن میں بہت زیادہ تبدیلی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کبھی وہ خود کو بہت زیادہ بھاری محسوس کرتے ہیں اور کبھی بہت ہلکا۔ اسی طرح جب ایک خلائی جہاز یا راکٹ بہت زیادہ رفتار سے زمین سے روانہ ہوتا ہے۔ تو کچھ دیر کے لئے خلا بازوں کا وزن کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اور خلا میں پہنچتے ہی وہ بالکل ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔ اور جب خلائی جہاز، زمین کے گرد اپنے مدار میں چکر لگاتا ہے تو انہیں ایک عجیب صورتحال کا کرنا پڑتا ہے۔ نہ وہ کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں، نہ لیٹ سکتے ہیں، یہاں تک کہ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ جیسے خلا باز کا کوئی وزن نہ ہو۔ خلا میں وزن صفر ہو جاتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ خلا میں زمین کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ کشش ثقل ہر وقت خلائی جہاز پر اثر کرتی ہے۔ لیکن جب خلائی جہاز تیزی سے زمین کے چاروں طرف گھوم رہا ہوتا ہے۔ تو اس کی تیز حرکت کی وجہ سے ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو کشش ثقل کے برابر ہو کر اس کا اثر زائل کر دیتی ہے۔ اور خلائی جہاز بے وزن ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اندر تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیتی ہیں۔

خلا میں جا کر آپ ایک جگہ سے پوری دنیا کو دیکھ سکتے ہیں۔ پھر آپ کو یقیناً پوری دنیا کے لڑائی جھگڑے بہت عجیب لگیں گے۔ کیونکہ وہاں سے تو زمین ایک اکائی، ایک گھر کی طرح نظر آتی ہے۔ بلاشبہ خلا سے امن کا بے مثال پیغام ملتا ہے۔

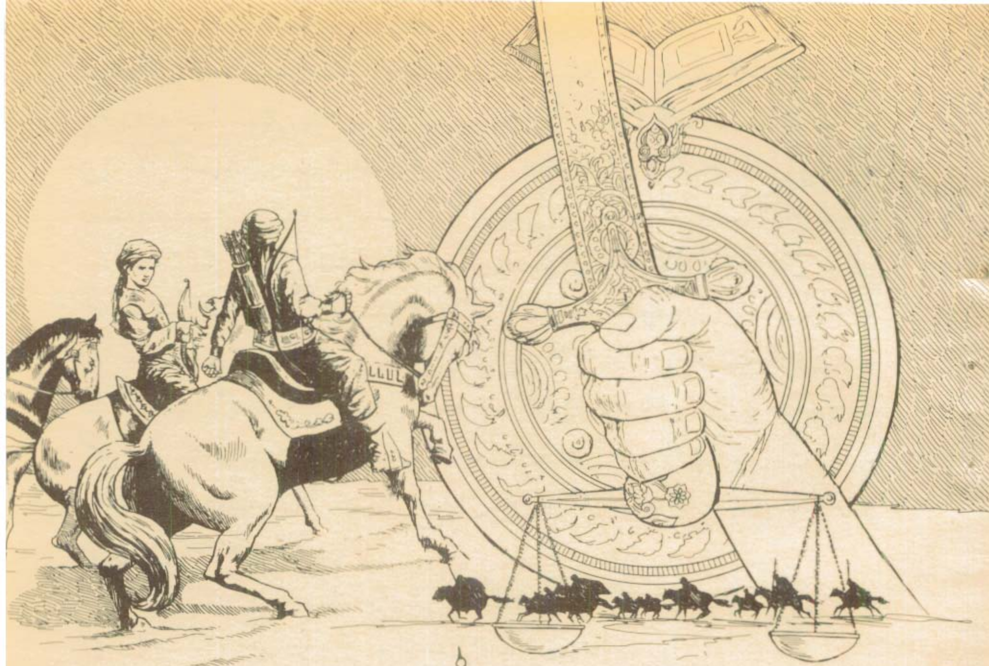

سیّد نظر زیدی

سلسلے وار ناول

قسط نمبر ۔ ۱

آزادی

(تین دوست)

یہ ۹۲ھ کا ایک نہایت ہی خوب صورت دن ہے۔ عرب کے صاف نیلے آسمان پر چمکنے والا سورج اپنے سفر کا آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکا ہے اور دوپہر کی گرمی ہوتے ہی ملک عراق کے مشہور شہر بصرے کے بازاروں میں پھر چہل پہل نظر آنے لگی ہے۔ ایرانی، مصری، رومی، افریقی، ترک

اور ہندوستانی وغیرہ دیس دیس کے مسافر اور خاص بصرے کے رہنے والے، رنگ رنگ کا لباس پہنے دکانوں پر خرید و فروخت کرتے پھر رہے ہیں۔ ان سب کے لباس اور شکل صورتیں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ لیکن ایک بات ان سب میں ایک سی نظر آتی ہے۔ اور وہ ہے ان کا سلیقہ۔سوار ہوں یا پیدل چلنے والے، سب کے سب ایسے ادب قاعدے سے چل رہے ہیں کہ کسی کو ذرہ بھر تکلیف نہیں ہونے پاتی، ننھے ننھے بچے اور بوڑھے بھی نہایت اطمینان سے چل پھر رہے ہیں۔ بصرے کی شان دار جامع مسجد میں ظہر کے وقت کی نماز ابھی ابھی ختم ہوئی ہے۔ نمازی مسجد کی سیڑھیاں اتر کر اپنے گھروں اور دکانوں کی طرف جارہے ہیں اور انہی میں ایک ہی عمر کے تین نوجوان بھی ہیں۔ شکل صورت اور لباس سے یہ نوجوان عرب کے مشہور قبیلے قریش سے معلوم ہوتے ہیں۔ سادہ سادہ معصوم چہرے اور بالکل معمولی کپڑے کے چوغے لیکن ان کی نگاہوں سے ایسا ارادہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ضرورت آپڑے تو اکیلے اکیلے ساری دنیا کے مقابلے میں ڈٹ جائینگے۔ ان میں سے خاص طور پر اس نوجوان کی شان اور سج دھج تو عجیب ہی ہے جو عمر میں دو تین سال چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

چلتے چلتے وہ تینوں ایک کھلے میدان میں رک گئے اور چھوٹی عمر کا نوجوان اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کہو سعید، نیزہ بازی کے مقابلے کی خوب تیاریاں ہو رہی ہیں؟''

سعید:۔ میری تیاری کا حال تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے، البتہ یہ موز بن ثابت خوب زور شور سے تیاری کر رہے ہیں۔ سنا ہے رات کو اپنے بستر پر بھی نیزہ بازی اور تلوار چلانے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔''

موز:۔ ''خیر یہ تو تم اپنی بات کر رہے ہو۔ البتہ یہ سچ ہے کہ میں اس سال ایک نہ ایک مقابلے میں جیتنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔''

کم عمر نوجوان:۔ ''کیا تلوار چلانے کے مقابلے میں؟''

کم عمر نوجوان کے اس سوال کے جواب میں موز بن ثابت کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سعید نے اس کی بات کاٹ کر کہا:۔

سعید:۔ ''نہیں بھئی! تلوار چلانے کے مقابلے میں نہیں بلکہ بھاگنے کے مقابلے میں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر کبھی لڑائی کے میدان سے بھاگنا پڑے تو کوئی بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔''

سعید کی یہ بات سن کر کم عمر نوجوان کے ساتھ خود موز بن ثابت بھی ہنس پڑا۔ اور جب ہنسی کا زور کسی قدر کم ہوا تو بولا۔ ''دیکھ رہے ہو! ان سعید صاحب کا مذاق اب حد سے بڑھتا جارہا ہے، خیر کوئی بات نہیں، میں بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے کرتے ہیں۔ تلوار تیر اور نیزہ بازی کے مقابلے میں ان کے ہاتھ تو چلتے نہیں، بے چارے، اس کے بدلے زبان چلاتے رہتے

ہیں۔"
سعید:۔ خیر مقابلے کے دن یہ بھی دیکھا جائے گا کہ کس کے ہاتھ زیادہ چلتے ہیں۔"
محمد:۔ "ارے رے رے، تو کیا تم لوگوں نے آپس ہی میں مقابلہ کرنے کی ٹھان رکھی ہے! دیکھو بھئی میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ اس سال یوں کام نہ چلے گا۔ ایک تو فوجی مدرسے میں ہماری تعلیم کا آخری سال ہے، دوسرے یہ بات سنی جارہی ہے کہ ایران، مصر، ترکستان اور روم وغیرہ بہت سے ملکوں کے نوجوان ان مقابلوں میں حصہ لیں گے۔ اگر تم لوگ اپنا مذاق نہیں اڑوانا چاہتے تو پوری پوری تیاری کرو۔"
موز:۔ "ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن بھئی یہ تو بتاؤ محمد! یہ مقابلے ہو کب رہے ہیں؟ ابھی دو تین دن پہلے سنا تھا کہ امیر المومنین ولید بن عبدالملک نے تاریخ بڑھا دی ہے!"
محمد:۔ "یہ بات سنی تو گئی تھی، لیکن غلط نکلی۔ آج ہی حضرت شیخ الاسلام فرمارہے تھے کہ فوجی کھیلوں کے یہ مقابلے پہلے کی طرح عید کے دن ہی ہونگے۔
سعید:۔ "پھر تو بہت کم دن رہ گئے۔"
محمد:۔ "اسی لئے تو کہہ رہا ہوں باتوں میں وقت برباد مت کیا کرو۔"
موز:۔ "لیکن محمد بھائی! یہ کوئی معقول اور اچھی بات کب سننے والے ہیں، اب اس پر غور کریں کہ کتنی دیر سے یہاں کھڑے فضول باتیں کر رہے ہیں۔"
سعید:۔ "اور شاید میرے ان قابل بھائی کو یہ بات یاد نہیں رہی کہ اس وقت ہم یہاں یونہی نہیں کھڑے بلکہ گھوڑوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"
موز:۔ "ارے سچ! یہ تو مجھے یاد ہی نہ رہا تھا۔ آج ماننا ہی پڑا کہ کبھی کبھی تم بھی کوئی کام کی بات کہہ گزرتے ہو۔"
محمد:۔ "اچھا بھئی باتیں بند۔ وہ دیکھو عاص اور سہیل گھوڑے لے کر آگئے۔ اب یہ کہو آج کا پروگرام کیا ہے؟"
سعید:۔ "ننگے پاؤں پتھریلی زمین پر بھاگنے کی مشق، دریا میں تیرنے کی مشق اور آخر میں تھوڑی دیر تلوار چلانے کا مقابلہ۔"
موز:۔ "لیکن بھئی میری تجویز تو یہ ہے کہ آج تلوار چلانے کی مشق رہنے دی جائے بلکہ اس کی جگہ ......!"
سعید:۔ (بات کاٹ کر) "اس کی جگہ بھاگنے ہی کی مشق کی جائے۔ کیوں!!"

سعید کی یہ بات سن کر موز اور محمد زور سے ہنس پڑے۔ موز بولا۔

"سعید تم بہت مسخرے ہوگئے ہو۔"

یہ تینوں نوجوان اس طرح کی باتیں کر رہے تھے کہ عاص اور سہیل ان کے گھوڑے لے کر آگئے اور تینوں سوار ہوکر ایک طرف کو روانہ ہوگئے۔

○○○○○○○○○

کئی میل پتھریلی زمین پر ننگے پیر بھاگنے اور دریا میں بہاؤ کے رخ تیرنے کی مشق کرنے کے بعد یہ تینوں دوست اپنے گھوڑوں کے پاس آکر گھر لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے کہ دور سے ایک سوار نظر آیا جو تیزی سے گھوڑا بھگاتا ہوا انہی کی طرف آرہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سوار ان کے پاس آکر رک گیا۔ یہ لمبے قد اور مضبوط ہاتھ پیروں کا آدمی تھا جس نے اپنے چہرے کو عمامے کے پلو سے اچھی طرح چھپا رکھا تھا۔ گھوڑا روک کر سوار نے باری باری تینوں نوجوانوں کو گھورا اور پھر رعب دار آواز میں بولا:۔

"اے لڑکو! تم اس جگہ کیا کر رہے ہو؟"

سوار کی یہ بات سن کر سعید نے اس کی آواز کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "اے سوار صاحب! آپ اپنی ناک پر بندھا ہوا کپڑا کیوں نہیں کھول لیتے، تاکہ سونگھ کر معلوم کر سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔" سعید کی یہ بات سن کر موز تو زور سے ہنس پڑا لیکن محمد نے نرمی سے کہا،

محمد:۔ "نہیں بھئی بڑوں کے ساتھ اس طرح کی باتیں نہیں کیا کرتے (سوار کی طرف دیکھ کر) معاف کیجئے جناب! ہمارے اس دوست کی عادت ذرا مذاق کی ہے۔ ہم یہاں فوجی کھیل کی مشق کر رہے ہیں۔"

سوار:۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

محمد:۔ "میں آپ کے اس سوال کا جواب بھی ضرور دوں گا۔ لیکن اس وقت جب آپ وجہ بتائیں کہ یہ سوال کیوں کیا ہے؟"

سوار:۔ "تم سب کے سب حد سے زیادہ مغرور معلوم ہوتے ہو۔"

سعید:۔ اور آپ کچھ ......!" سعید نے اپنے دونوں ہاتھ سر کو لگا کر انگلیاں نچائیں، جس کا مطلب تھا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے آپ کا دماغ کچھ ٹھیک نہیں۔ سوار یہ حرکت دیکھ کر اور بھی غصے میں بھر گیا اور پوری قوت سے چلّا کر بولا،

سوار:۔ خاموش! تمہیں معلوم نہیں اس وقت کس سے بات کر رہے ہو؟

محمد:۔ "چاہے آپ کوئی بھی ہیں، لیکن میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ یونہی بے مطلب غصہ کرنے کی

عادت ٹھیک نہیں۔ اگر آپ ہم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو شریفوں کی طرح پوچھئے۔ ورنہ آپ کی کسی بات کا جواب نہ دیا جائے گا۔"

سوار۔ ۔ اچھا، تمہاری یہ جرأت! لیکن یاد رکھو اگر میری باتوں کا جواب نہ دیا تو اس تلوار سے تم سب کو سیدھا کر دوں گا۔" یہ کہہ کر سوار نے تلوار نکال لی اور اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ کر ایڑ لگائی جس سے وہ پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ سوار لڑنے مرنے پر تیار ہے، یہ حالت دیکھ کر ان تینوں نوجوانوں نے بھی تلواریں نکال لیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ کوئی حملہ کرتا، محمد نے سعید اور موز کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ٹھہرو، ایک آدمی کے مقابلے میں ہم میں سے صرف ایک کو آنا چاہئے۔ یہ بہت بزدلی ہوگی کہ ہم تینوں ایک آدمی کو گھیر لیں۔"

سوار۔ ۔ "اور میں کہتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی اور ساتھی بھی ہو تو اسے بلا لو۔ میں تم سب سے لڑنا چاہتا ہوں۔"

محمد۔ ۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہم سے لڑنا ہی کیوں چاہتے ہیں؟"

سوار۔ ۔ "اس لئے کہ مجھے تمہاری تلواروں اور گھوڑوں کی ضرورت ہے۔"

موز۔ ۔ "اچھا یہ بات ہے، گویا تم ڈاکو ہو!"

سوار۔ ۔ "کچھ بھی سمجھ لو، مجھے تمہارے گھوڑوں اور ہتھیاروں کی ضرورت ہے یہ چیزیں لئے بغیر یہاں سے نہ جاؤں گا۔ اور تم تینوں کی بھلائی اس میں ہے کہ یہ چیزیں میرے حوالے کر دو۔"

محمد۔ ۔ "یوں نہیں، یہ چیزیں لینے کے لئے شاید تمہیں بہت زیادہ قیمت دینی پڑے گی۔" یہ کہہ کر محمد چھلانگ لگا کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور تلوار والا ہاتھ اونچا کرتے ہوئے بولا۔ "لو آؤ۔ ہمت ہے تو میری تلوار اور گھوڑا چھین لو۔ میرے ساتھی اس لڑائی میں بالکل حصہ نہ لیں گے۔ ان کی طرف سے بے فکر رہو۔"

یہ بات سن کر سوار نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا اور محمد پر وار کرنے شروع کر دیئے، محمد نے ایک طرف جھک کر سوار کے وار خالی دیئے اور اس کے بعد سنبھل کر مقابلہ کرنے لگا۔ تلوار چلانے میں سارے عراق میں کوئی بھی محمد کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا لیکن اس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ادھیڑ عمر کا یہ سوار بھی کوئی معمولی آدمی نہیں۔ وہ ایسی پھرتی اور ہوشیاری سے لڑ رہا تھا کہ اس بہادر نوجوان کا ہر داؤ بے کار ہو جاتا تھا اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے اسے حد سے زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔

یہی حال سوار کا تھا، شروع شروع میں تو اس کے لڑنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بچوں کو بہلاتا ہے،

لیکن آہستہ آہستہ محتاط ہوتا گیا اور آخر میں تو اس کے چہرے سے یوں معلوم ہونے لگا کہ وہ اس کم عمر نوجوان کے حملوں سے گھبرا رہا ہے۔

یہ مقابلہ کوئی بیس منٹ تک جاری رہا اور معلوم نہیں کتنی دیر اور جاری رہتا لیکن دن بھر کا تھکا ہارا سورج آرام کرنے کے لئے دور اونچے پہاڑوں کی اوٹ میں آگیا اور سوار نے محمد کا ایک خطرناک وار بچا کر اپنے گھوڑے کی لگام موڑ کر ایڑ لگائی اور جس تیزی سے بھاگتا ہوا آیا تھا اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔

سوار کے جانے کے بعد محمد نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں یہ شخص کون تھا۔ لیکن میں اس کی بہادری کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ چاہتا تو ابھی اتنی ہی دیر تک اور لڑ سکتا تھا۔"

سعید اور موز جلدی سے محمد کے پاس آئے اور ایک ساتھ سوال کیا۔ "کیا تم زخمی تو نہیں ہوئے محمد؟"

محمد:۔ "نہیں، لیکن میرے جسم پر کئی گہرے زخم لگ سکتے تھے۔ میرے دشمن نے موقع پا کر بھی مجھے چھوڑ دیا، معلوم نہیں وہ کون تھا؟"

سعید:۔ "وہ جو کوئی بھی تھا میں بھی اس کی بہادری کی تعریف کرتا ہوں۔"

موز:۔ "وہ واقعی حد سے زیادہ بہادر اور پھرتیلا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا اس نے کئی بار جان بوجھ کر محمد کی رعایت کی۔ اگر وہ انہیں ہرا نہیں سکتا تھا تو زخمی ضرور کر سکتا تھا۔"

محمد:۔ "بیشک۔"

اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے یہ تینوں دوست اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

○ ○ ○ ○ ○ ○

محمد، سعید اور موز بن ثابت نے شہر کے باہر بنی ہوئی ایک چھوٹی سے مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ شہر میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ انہیں دور سے وہی سوار نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ان تینوں دوستوں نے اپنے گھوڑے روک لئے۔ سوار نے بھی دور سے ان تینوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ انہی کی طرف موڑ دیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے پاس آکھڑا ہوا۔ سعید نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں جناب! کیا اب پھر ہمارے گھوڑے اور تلواریں چھیننے کے لئے آئے ہیں؟ یاد رکھئے اب اپنا گھوڑا چھنوا کر جائینگے آپ۔"

سوار:۔ "نہیں میرے بچو! اب میں تمہیں شاباش دینے آیا ہوں۔"
موز:۔ "شاباش......!"
سوار:۔ "ہاں شاباش، میں تمہاری بہادری کی تعریف کرتا ہوں۔"
سعید:۔ "اجی جناب! آپ ہماری بہادری کی تعریف تو کر رہے ہیں لیکن پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ ہیں کون اور اب سے تھوڑی دیر پہلے آپ کو ہو کیا گیا تھا؟"

"میں......!" یہ کہہ کر سوار نے عمامے کا پلو چہرے سے اتار دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں امیرالمومنین کی فوج کا ایک معمولی سپاہی ہوں اور میرا نام بدیل بن طہفہ ہے۔"

"بدیل بن طہفہ!" محمد نے حیرت بھری آواز میں کہا اور مصافحے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا:۔

محمد:۔ آپ مسلمان قوم کے ایک بہادر بیٹے ہیں۔ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔
بدیل:۔ اور جس قدر خوشی مجھے ہوئی ہے تم شاید اس کا اندازہ نہ کر سکو۔ آج تمہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دنیا کے آخری سرے پر رہنے والے انسان کے کانوں تک بھی ہم اسلام کا سچا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہونگے۔ دنیا کی کوئی قوم ہمارا راستہ نہیں روک سکتی۔ ہم برابر آگے بڑھتے جائینگے۔ یہاں تک کہ مصر اور ایران کی طرح ترکستان، اندلس، ہندوستان اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی امن اور انصاف کی حکومت قائم ہو جائے گی۔"
محمد:۔ "انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔ اندھیرا روشنی کا راستہ نہیں روک سکتا، اسلام ایک نور ہے اور کفر تاریکی۔ ایک نہ ایک دن نور تاریکی پر ضرور فتح پائے گا۔"
بدیل:۔ "یہ بات ٹھیک ہے، لیکن روشنی کی قندیلیں روشن کرنے اور ان کونوں تک پہنچانے کے لئے جہاں گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے بہادر نوجوانوں کی ضرورت ہے اور میں خوش ہوں کہ ہماری قوم میں تم جیسے نوجوان موجود ہیں۔"
محمد:۔ "لیکن بزرگ سردار! میں تو اپنے اندر کوئی ایسی بات نہیں پاتا، ایک بیوہ ماں کا معمولی اور غریب بیٹا ہوں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس دنیا سے ظلم اور بے انصافی کا خاتمہ کرنے کے لئے میرے دل میں بہت سے ارمان ہیں۔ اس اچھے کام کے لئے اگر میری جان بھی چلی جائے تو خوشی ہوگی۔"
بدیل:۔ "میرے بیٹے! تم ایک معمولی اور عام لڑکے ہر گز نہیں ہو۔ اس تھوڑی سی عمر میں تمہارے اندر ایک بہت بڑے سپہ سالار اور مجاہد کی خوبیاں دیکھ رہا ہوں۔ بیٹا! اس وقت میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ عقل اور جسم کی قوت اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعام ہیں، تمہیں اس نے یہ دونوں انعام

بخشے ہیں۔ اب انہیں کسی برُے کام میں ہرگز خرچ نہ کرنا، ساری زندگی دنیا کی بھلائی کے کاموں میں لگے رہنا۔ جو کمزور اور مظلوم ہیں ان کی مدد کرنا، جو ظالم اور بے انصاف ہیں انہیں سزا دینا، اسلام کا یہی حکم ہے۔ "

محمد:۔ " آپ بے فکر رہئے میں جب تک زندہ رہوں گا ان ہی اچھے کاموں کے لئے کوشش کرتا رہوں گا۔ میری عقل اور جسم کی قوت آخری وقت تک اسلام کے کاموں میں خرچ ہوگی۔ "

موز بن ثابت اور سعید خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ بدیل نے اپنی بات ختم کر کے اچانک ان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولے،

بدیل:۔ " تم نے تو یہ بات بالکل سچ جان لی ہوگی کہ میں تمہارے گھوڑے اور تلواریں چھین لینے کے لئے ہی آیا ہوں! "

سعید:۔ " کیونکہ جھوٹ بولنا سخت گناہ ہے، اس لئے میں یہی کہوں گا کہ میرا یہی خیال تھا۔ "

بدیل:۔ " اور اب ...... ؟ "

سعید:۔ " اب یہ خیال تو نہیں لیکن میں حیران ضرور ہوں کہ آخر آپ جیسے اچھے آدمی کو یہ سوجھی کیا! "

سعید کی یہ بات سن کر بدیل بن طہفہ مسکراتے ہوئے بولے،

بدیل:۔ " اصل بات یہ ہے میرے بیٹے کہ اس طرح میں تم لوگوں کی بہادری کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ خاص طور پر محمد کی بہادری کی میں نے بہت تعریف سنی تھی اور مجھے کئی بار خیال آیا تھا کہ کہیں یہ تعریفیں اس وجہ سے تو نہیں ہوتیں کہ یہ عراق کے حاکم حجاج بن یوسف کے بھتیجے ہیں۔ "

موز:۔ " لیکن آپ کو حجاج بن یوسف کے بارے میں ایسا خیال ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان میں اور لاکھ برائیاں ہوں لیکن یہ خوبی ضرور ہے کہ وہ ناجائز طور پر کسی سے رعایت نہیں کرتے۔ اگر محمد کو دمشق کے مقابلے کے لئے چنا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ واقعی اس قابل ہیں۔ "

بدیل:۔ ہاں تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کوئی بری بات نہیں ہوئی کہ میں نے اپنا شبہ مٹالیا۔ اس طرح تم لوگوں سے ملاقات بھی ہوگئی۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں تم۔ کہیں سال چھ مہینے میں دو چار دن کے لئے گھر آنے کی فرصت ملتی ہے؟ "

سعید:۔ آپ نے شبہ تو مٹالیا، لیکن اگر خدانخواستہ محمد کے ہاتھ سے چوٹ لگ جاتی تو؟ " یہ بات سن کر سب کے سب ہنس پڑے۔ اور اس کے بعد بدیل ان نوجوانوں سے رخصت ہوکر ایک طرف روانہ ہوگئے۔

(باقی آئندہ)

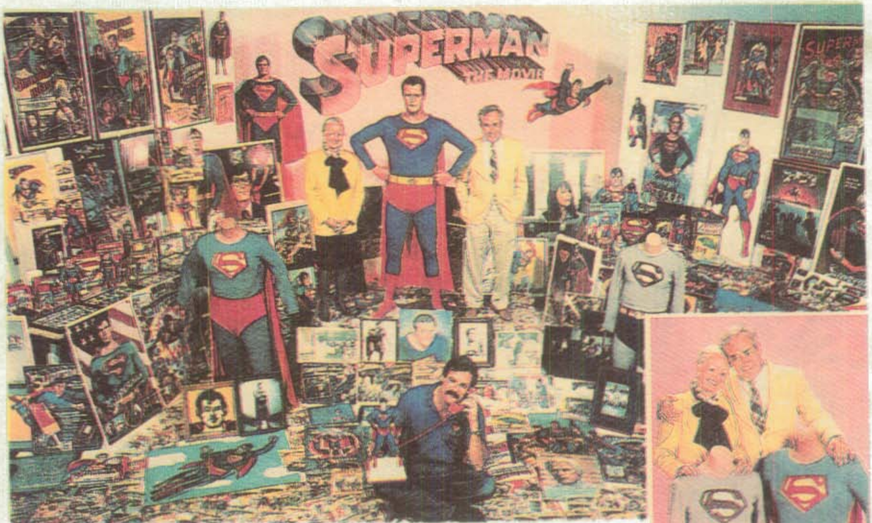

شوق کا کوئی مول نہیں

شعبۂ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی

فلم اور ٹیلی ویژن کے عالمی شہرت یافتہ کردار "سپرمین" سے تو آپ واقف ہی ہونگے۔ آیئے آج ہم آپ کی ملاقات سپرمین کے ایک دیوانے سے کرواتے ہیں۔

بڑی تصویر میں جو صاحب دکان سجائے، بیٹھے ہوئے کسی کو ٹیلی فون کر رہے ہیں، ان کا نام "جم ہیم برک" ہے۔ سپرمین جم کا پسندیدہ کردار ہے اس لئے اس نے اب تک سپرمین کے چالیس ہزار سے زیادہ ماڈل، تصاویر، لباس، پوسٹرز، اسٹیکرز اور کتابیں جمع کرلی ہیں۔ ان سب کی مالیت کا سن کر ممکن ہے آپ کا منہ حیرت سے کھلا رہ جائے۔ "دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپے!"

چھوٹی تصویر میں جم کے دوست نول نیلن اور جیک لیرسن (میاں بیوی) سپرمین کے جن دو کاسٹیوم کے ساتھ کھڑے ہیں ان کی قیمت تیس لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ یہ لباس سپرمین کی پہلی بلیک اینڈ وائٹ فلم میں استعمال ہوئے تھے۔ آپ اگر خط لکھ کر جم کو اتنے مہنگے مشغلے سے باز رکھنا چاہیں تو اس پتہ پر خط لکھ سکتے ہیں۔

GIM HAMBIRCK
17613 - LOCAST STREET,
FOUNTAIN VALLEY,
CALIFORNIA - USA

گنیز بک کی چند تصویریں

دلچسپ ورلڈ ریکارڈ

تفصیل سامنے کے صفحے پر

دُنیا کا سب سے چھوٹا آدمی

بونا ڈرم ماسٹر — جو خود ڈرم سے چھوٹا تھا

بونوں کا جڑواں جوڑا

دیا سلائی کے مصالحے سے بھی مختصر
دُنیا کا سب سے چھوٹا ہیرا

"گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز" اس وقت دنیا کی ایک مقبول ترین کتاب ہے، اس کتاب میں دنیا جہاں کے تقریباً ہر موضوع پر ریکارڈز جمع کر دیئے گئے ہیں، اور ان ریکارڈز پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہر ریکارڈ کو کافی پرکھنے کے بعد کتاب میں شامل کیا جاتا ہے اور ہر سال اس کتاب کی تدوینِ نو کی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اب تک دنیا میں جتنی بھی بڑی بڑی دریافت وایجادات ہوئی ہیں ان سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پوشیدہ ہوتا ہے، کچھ اسی طرح کا حادثہ گنیز بک کے وجود کے سلسلے میں بھی پیش آیا۔

یہ واقعہ ۱۵ نومبر ۱۹۵۱ء کا ہے، وہ ہفتہ کا دن تھا۔ گنیز نامی فرم کے مینجنگ ڈائریکٹر سرہف بیور آئر لینڈ کے جنوب مشرق میں واقع ویکس فورڈ کاؤنٹی میں دریائے سلانے کے کنارے اپنے دوستوں کے ہمراہ پرندوں کا شکار کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے گولڈن پلاور نامی جن پرندوں کا وہ شکار کر رہے تھے وہ اپنی تیز رفتاری کے باعث بہت کم ان کے نشانے کی زد میں آرہے تھے۔ اسی شام کیسل برج ہاؤس میں اس مسئلے پر بحث چھڑ گئی کہ گولڈن پلاور یورپ کا تیز ترین شکاری پرندہ ہے یا کوئی اور پرندہ ہے کچھ لوگ گولڈن پلاور کے حق میں تھے اور کچھ اسے غلط قرار دے رہے تھے، وہاں پر موجود تمام دعویداروں میں سے کوئی بھی اپنے دعوے سے پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا، اور کوئی ایسی حوالہ جاتی کتاب یا ریکارڈ بک وغیرہ بھی موجود نہیں تھی جس کے ذریعے اس دعوے کے سچے یا جھوٹے ہونے کا پتا چلتا۔

اس وقت تو یہ معاملہ دب گیا لیکن اگست ۱۹۵۴ء میں کسی نے پھر یہ دعویٰ کر دیا کہ یورپ کا تیز ترین شکاری پرندہ پلاور نہیں بلکہ گراؤس ہے اور پھر یہ بحث بڑھتی گئی، اس بحث نے گنیز کے مینجنگ ڈائریکٹر سرہف بیور کو ایک راہ دکھائی۔ انہوں نے سوچا کہ پرندے کی تیز رفتاری کے علاوہ مختلف چیزوں کے بارے میں لوگ مختلف دعوے کرتے ہوں گے اور ان پر بھی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی ہوں گی، جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہوگا اور کوئی بھی شخص ان کی تردید یا تصدیق صرف اس وجہ سے نہیں کر سکتا کہ ایسی کوئی کتاب سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ جس کی روشنی میں مختلف دعوؤں کا فیصلہ کیا جاسکے۔ لہٰذا کیوں نہ ریکارڈز پر مشتمل کوئی کتاب مرتّب کی جائے۔

اور پھر اسی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرہف بیورو نے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۴ء کو ریکارڈز کی کتاب مرتب کرنے کی تیاری شروع کر دی اور اس سلسلے میں حقائق اور اعداد و شمار جمع کرنے والی لندن کی ایک ایجنسی کے مسٹر نورس اور مسٹر راس مک ورتھر سے تعاون کی درخواست کی۔ گنیز بک کا دفتر ۱۰۷ فلیٹ اسٹریٹ پر قائم کیا گیا۔ اور ۱۹۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی تیاری کے لئے بھرپور طور پر کام شروع کر دیا گیا۔

گنیز بک کی پہلی کاپی ۲۷ اگست ۱۹۵۵ء کو بازار میں آئی اور اسی سال کرسمس سے پہلے یعنی ۲۵ دسمبر ۱۹۵۵ء سے پہلے گنیز بک کا نام سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں کی فہرست میں سب سے اوپر درج تھا۔

جب سے اب تک سوائے دو سالوں کے ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۹ء کے گنیز بک کو ہر سال سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں کی فہرست میں نمبر ون ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۹ء میں یہ کتاب چند وجوہات کی بناء پر شائع نہیں ہو سکی تھی۔

اب تک گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے ۳۵ زبانوں (انگریزی (برطانوی، امریکن) فرانسیسی، جرمن، جاپانی، اسپینی، ڈینش، نورویگین،

سویڈش، فنش، اطالوی، ڈچ، پرتگالی، چیکو سلاوکی، عبرانی، سربو کبروٹ، آئس لینڈی، سلووینائی، یونانی، انڈونیشیائی، چینی، ترکی، ہندی، ملاوی، عربی، تھائی، تامل، تیلگو، ملیالم، کناڈا اور ہنگرین) میں کل ۲۶۲، اایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء تک گنیز بک کی عالمی فروخت ۶ کروڑ سے بھی تجاوز کر گئی۔ اگر فروخت کی جانے والی گنیز بک کو اوپر تلے جوڑا جائے تو کتابوں کے ۱۶۸ ایسے عظیم الشان مینار کھڑے ہو جائیں گے جن کی بلندی ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی زیادہ ہوگی۔

حیرت انگیز ہے یہ دنیا ہماری

گنیز بک سے انتخاب

۱۔ تصویر میں آپ کو جو دو صاحبان اپنی موٹر سائیکلوں کے ساتھ نظر آرہے ہیں یہ دنیا کے سب سے پستہ قد جڑواں بھائی فلوریڈا (امریکہ) کے جان رائس اور گریگ رائس ہیں۔ یہ دونوں ۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت ان دونوں بھائیوں کا قد ۳۴ انچ ہے۔

۲۔ تصویر میں آپ کو دنیا کا سب سے چھوٹا ہیرا نظر آرہا ہے۔ اس ہیرے کا وزن ۰٫۰۰۰۰۶۳ قیراط ہے آپ کو تصویر میں ماچس کی تیلی کا سر بھی نظر آرہا ہے۔ آپ اس سے ہیرے کے حجم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ تصویر میں جو ایک چھوٹے سے قد کے صاحب کھڑے نظر آرہے ہیں وہ دنیا کے سب سے پست قامت انسان ڈومنیکسن ری پبلک کے نیلسن ڈی لاروزا اکینو ہیں۔ نیلسن جون ۱۹۶۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ پست قامت نوجوان سیکلس سنڈرم نامی مرض کا شکار ہیں۔ ۲ اپریل ۱۹۸۷ء کو جب ان کا مکمل میڈیکل چیک اپ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان کا وزن ۶٫۸۱ کلو گرام اور قد ۲۸٫۳ انچ ہے۔ نیلسن صاحب کا سینہ ۱۷ انچ اور کمر ۱۶ انچ کی ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق نیلسن کا قد اب اور نہیں بڑھ سکے گا۔

۴۔ آپ کو تصویر میں ایک سائیکل پر کافی افراد سوار نظر آرہے ہیں۔ ان سواروں کی کل تعداد سولہ ہے۔ ایک سائیکل پر ۱۶ افراد کو سوار کر کے سائیکل چلانے کا مظاہرہ جاپان کے ایک سائیکل کلب کے ممبروں نے کیا۔ ان سولہ سواروں نے ایک سائیکل پر ۱۶۴ فٹ (۵۰) میٹر کا فاصلہ طے کیا۔

۵ تصویر میں آپ کو جو مینڈک صاحب نظر آرہے ہیں۔ ان کا شمار دنیا کے چند بڑے مینڈکوں میں ہوتا ہے۔ ان مینڈک صاحب کا نام "کولوس" ہے۔ یہ ۱۹۷۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت کولوس صاحب کا وزن ۱٫۸۹ کلو گرام ہے۔

۶۔ تصویر میں ٹائر کے اندر آپ کو جو صاحب نظر آرہے ہیں۔ وہ پرتگال کے انتونیو فیرورو ہیں۔ ان کا ۱۱ فروری ۱۹۸۹ء کو انتقال ہو گیا تھا، ان کا قد صرف ساڑھے ۲۹ انچ تھا، وہ ایک پاپ میوزک گروپ میں ڈرم بجایا کرتے تھے۔

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

آنکھ مچولی بیرون ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰/- روپے
زرِ سالانہ ہمارے دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوادیں

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲، ڈی سائٹ کراچی نمبر ۱۶

ڈنڈا ڈولی

انعامی لطیفہ

ایک استاد نے بچوں کو مضمون لکھنے کو دیا جس کا عنوان تھا "ہمارے ماں باپ "۔
ایک بچے نے اپنے مضمون میں یہ جملہ لکھا "ہمارے ماں باپ ہمیں اس وقت ملتے ہیں جب وہ کافی بڑے ہو چکے ہوتے ہیں اور اس طرح ان کی عادتوں کو بدلنا ہمارے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔"

نیر توحید ...... شیخوپورہ

استاد طالب علموں کو سبق پڑھا رہا تھا "دِس اِز مائی ہیڈ۔ یہ میرا سر ہے"۔ ایک طالب علم جب گھر پہنچا تو پڑھنے لگا۔

"دِس اِز مائی ہیڈ۔ یہ استاد کا سر ہے"۔
جب اس لڑکے کے باپ نے سنا تو کہنے لگا "بیٹا دس از مائی ہیڈ کے معانی ہے یہ میرا سر ہے۔" لڑکا دوسرے دن اسکول پہنچا۔ استاد نے سبق پڑھنے کو کہا۔ وہ پڑھنے لگا۔"دس از مائی ہیڈ۔ یہ میرے ابو کا سر ہے"۔
استاد نے اس سے کہا "نہیں بیٹے اس کے معانی ہوں گے یہ میرا سر ہے"۔ شاگرد نے معصومیت سے کہا "سر ابو کہتے ہیں یہ میرا سر ہے۔ آپ کہتے ہیں یہ میرا سر ہے۔ میں کس کی بات مانوں"؟

آکاش ایم اکرم ...... سجاول

دو افیمی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک نے دوسرے سے کہا کہ "آؤ اسلام آباد چلیں دوسرے نے کہا "ہم کیسے جائیں گے"۔ پہلے نے کہا کہ لیٹر بکس میں سر پھنسا دیتے ہیں ڈاکیا آکر لے جائے

گا۔ دونوں نے ایسا ہی کیا جب ڈاکیہ آیا تو اس نے دونوں کو دو دو جوتے لگائے۔

پہلا! یہ کیا ہو رہا ہے۔

دوسرا! یہ اسلام آباد کی ٹکٹیں لگ رہی ہیں۔

شازیہ عزیز...... کراچی

(ایک دوست دوسرے دوست سے) یار یہ بتاؤ کہ قوال قوالی گاتے وقت اپنا ایک ہاتھ کان پر کیوں رکھتے ہیں؟

(دوسرا دوست) اس لئے تاکہ اپنی بھیانک آواز نہ سن سکیں۔

شہزادہ فیصل...... لاہور

عطیہ (سعدیہ سے) "اس دفعہ میں ایسی چیز بھیج رہی ہوں جسے رسالے کا ایڈیٹر ہر حال میں قبول کر لے گا۔"

سعدیہ۔ "وہ کیا چیز ہے؟"

عطیہ۔ "سالانہ خریداری کے لئے ۱۵۰ روپے کا چیک!"

عطیہ العلیم...... کراچی

بچاؤ! بچاؤ! کھال میں سانس باقی ہے

ابھی تو یہیں تھا!!!

ایک پتہ

نام .... جویریہ قیوم
شہر .... جوہر آباد
ضلع .... خوشاب
ملک .... پاکستان
برّاعظم .... جنوبی ایشیا
سیارہ .... زمین
مخلوق .... انسان

ٹیچر (بچوں سے) "ترقی یافتہ ممالک میں بچے پندرہ سال کی عمر میں ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو

جاتے ہیں۔ "

حنیف (حیرت سے) "اس میں بھلا ترقی یافتہ ہونے کی کون سی بات ہے سر! ہمارے پاکستان میں تو ایک سال کا بچہ دوڑنے لگتا ہے۔ "

محمد سعید سومرو......

یقیناً تم نے چنبیلی کا تیل لگا لیا ہو گا

ایک ہوائی جہاز میں بہت سے پاگل سفر کر رہے تھے کہ جہاز فضا میں بلند ہوتے ہی ہلنے لگا۔ پائلٹ نے گھبرا کر اپنے اسسٹنٹ سے کہا "اندر جا کر دیکھو جہاز کیوں ہل رہا ہے۔ " اسسٹنٹ اندر گیا تو اس نے دیکھا کہ تمام پاگل فٹ بال کھیل رہے ہیں۔ صرف ایک پاگل بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے جا کر پائلٹ کو بتایا۔ پائلٹ بولا۔ جو کتاب پڑھ رہا ہے اس سے کہو کہ اپنے ساتھیوں کو منع کرے ورنہ جہاز گر جائے گا۔ " اسسٹنٹ اندر چلا گیا تو جہاز ٹھیک چلنے لگا۔ پائلٹ نے خوش ہو کر اسسٹنٹ سے کہا کہ ان کا شکریہ ادا کرو۔ اسسٹنٹ اندر گیا تو دیکھا کہ صرف وہی شخص بیٹھا ہے جو کتاب پڑھ رہا تھا اس نے پوچھا۔

"دوسرے کہاں ہیں؟"

"میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ باہر جا کر کھیلو، ورنہ جہاز گر جائے گا، وہ سب باہر چلے گئے۔ " پاگل نے اطمینان سے جواب دیا۔

مہر احمد نواز لیل...... شور کوٹ

ایک فرانسیسی نوجوان لندن میں تین سال تک انگریزی کی تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ جب وطن جانے لگا تو الوداعی ملاقات کے لئے اپنے انگریزی کے استاد کے پاس گیا اور غلط سلط انگریزی بولتے ہوئے کہنے لگا "استاد محترم آپ نے جس توجہ اور انہماک سے مجھے انگریزی پڑھائی ہے میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ بتائیے میں وطن جا کر آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"صرف ایک خدمت کرنا، وہاں کسی کو یہ مت بتانا کہ تمہیں انگریزی میں نے پڑھائی ہے۔ "

عماد الٰہی...... لاہور

پہلا دوست: (دوسرے دوست سے) یار یہ جو شادی کارڈ وغیرہ پر لکھا ہوتا ہے ج، س، م، ف اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

دوسرا دوست: "جوتوں سے مرمت فرمائیں۔" میرے دوست نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

عمران محمد اسماعیل حیدر آباد

استاد نے شاگرد سے پوچھا!
"اونٹوں سے تو آپ قطار میں چلنا سیکھتے ہیں۔ بتاؤ کہ شہد کی مکھیوں سے تم کیا سبق سیکھتے ہو؟"۔
شاگرد (معصومیت سے) جو چھیڑے اسے ڈنگ مارو۔ محسن علی قاسمی...... کراچی

کسی آدمی نے لائبریرین کو آدھی رات کو فون کیا کہ لائبریری کتنے بجے کھلتی ہے۔
لائبریرین...... سات بجے صبح لیکن آدھی رات کو فون کرنے کا مقصد؟
آدمی سات بجے سے پہلے نہیں کھل سکتی؟
لائبریرین...... لیکن آپ اس سے پہلے کیوں لائبریری میں جانا چاہتے ہیں؟
آدمی...... (جھنجلا کر) لائبریری میں کون کم بخت جانا چاہتا ہے۔ مجھے تو لائبریری سے باہر آنا ہے۔

انجم ارشاد...... فیصل آباد

مالک مکان نے نئے کرایہ دار سے پوچھا۔ "آپ کے بچے بھی ہیں۔" ان صاحب نے جواب دیا۔ "جی ہاں چھ، سب کے سب قبرستان میں ہیں۔"
مالک مکان نے یہ سن کر افسوس کرتے ہوئے کرایہ نامے پر دستخط کر دیئے اور مکان کی چابی کرایہ دار کو تھما دی۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ چھ کے چھ بچے قبرستان سے واپس آگئے جہاں وہ کھیلنے کے لئے گئے تھے لیکن اب کرایہ نامہ منسوخ نہیں ہو سکتا تھا۔

عبدالمتین، کراچی

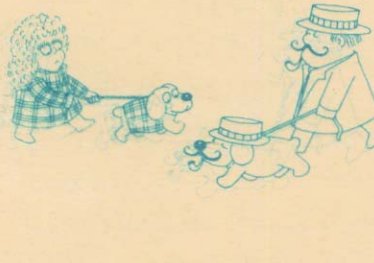

اسے کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزے کا رنگ پکڑنا!

خودغرض

شازیہ فرحین

"سلام استاد" لالو نے ورکشاپ میں داخل ہوتے ہوئے بڑے تپاک سے استاد بشیر کو سلام کیا اور ڈانگری چڑھائے اندر کو چلا آیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ میلی کچیلی ڈانگری میں ملبوس تھا اور مٹی کے تیل میں ہاتھ ڈالے بڑی مہارت اور دلجمعی سے انجن کے ایک ایک پرزے کو رگڑ رہا تھا۔

"شاباش لالو ایسے ہی کرتا جا دیکھ اگر تو ایسا ہی دل لگا کر کام کرتا گیا تو تیری اُجرت بڑھا دوں گا۔" استاد نے اپنے پیلے پیلے دانتوں کو باہر نکال کر اس سے کہا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اب وہ کام میں مزید تیزی دکھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ واقعی اگر استاد نے کچھ پیسے بڑھا دیئے تو شاید وہ اپنا مقصد حاصل کر سکے گا۔ اس کا مقصد کیا تھا، یہی نا کہ وہ پڑھے لکھے، خوب نام کمائے، لوگ اسے بھی عزت سے دیکھیں مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ سوچتے سوچتے وہ کہاں کھو گیا چونکا تو اس وقت جب استاد نے آکر اسے ٹھوکا دیا۔

"ابے لالو کیا سوچ رہا تھا؟" استاد بلند آواز میں قدرے ڈانٹ کر بولا کیونکہ وہ حاکم تھا اور ایسا کہنے کا اختیار رکھتا تھا۔

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ...." اب بھلا وہ کیا بتاتا۔یقیناً وہ اگر استاد کو اپنے

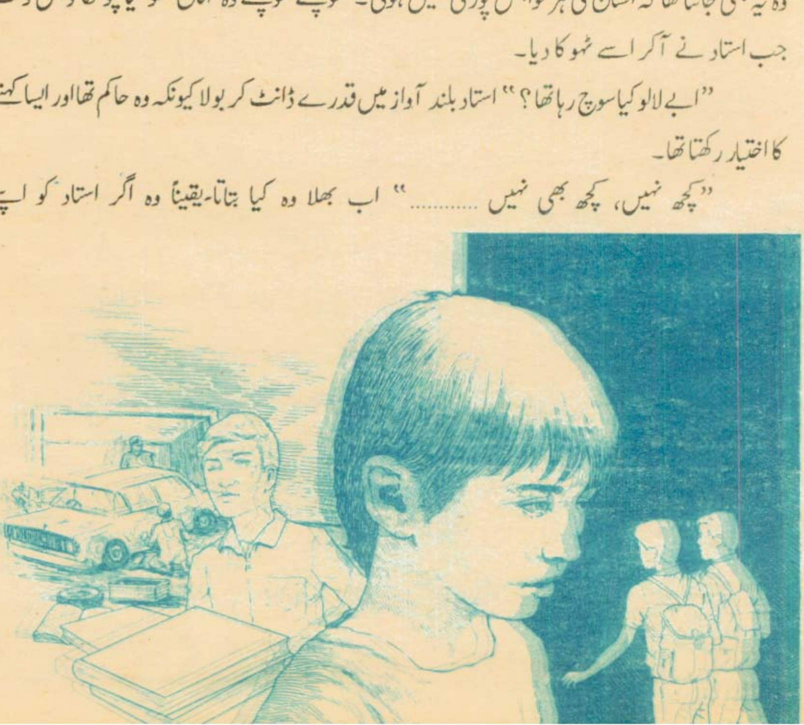

انھوں نے خیالات سناتا تو وہ قہقہہ لگا کر ضرور ہنس دیتا۔

چپ چاپ وہ اپنے خیالوں میں مگن ایک دفعہ پھر کام میں مصروف تھا، سامنے ہی چھیما اخبار کے ٹکڑے میں رکھے ہوئے نٹ بولٹ کو کپڑے سے پونچھ رہا تھا اور لالو کی نظر تو جیسے اخبار پر ٹکی ہوئی تھی۔ کاش وہ پڑھنا جانتا۔

"کیا ہوا لالو ......" چھیما اس کی حالت دیکھ کر کچھ کچھ پریشان سا ہو گیا مگر وہ کسی کو کیا بتاتا۔

کچھ دیر بعد سب کھانے میں مصروف ہو گئے وہ بھی گھر سے لائی ہوئی سوکھی چپاتی کو اپنے حلق سے نیچے اتارنے لگا .... روز کی طرح۔

"اے لڑکے سنو ذرا!" جب وہ روٹی کھا چکا تو اسکول کے لباس میں ملبوس ایک لڑکا اسے اپنے پاس بلا رہا تھا ایک لمحے کو اسکول کا لباس دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ جلدی جلدی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

"سنو تمہارا نام کیا ہے؟"

"لالو ......" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"اور آپ کا نام ......؟" لالو نے بغیر کسی وقفہ سے سوال کر ڈالا۔

"میرا نام رمیز ہے اور مجھے تم سے ایک کام ہے۔" رمیز نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"کام ...... اور مجھ جاہل سے! رمیز بھائی کیوں مذاق کرتے ہو۔" لالو افسردگی سے بولا۔

"بھئی جب بھائی ہی بنا لیا ہے تو کام بھی یقیناً میرا بن جائے گا۔ کیوں ٹھیک کہا نا؟"

"ہاں ......" رمیز کی بے تکلفی اسے بہت بھا رہی تھی اس لئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں تو لالو، دراصل میں تمہیں پڑھانا چاہتا ہوں۔" رمیز نے دھیرے سے اپنا مدعا بیان کیا اور لالو پر تو جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کبھی وہ اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا تو کبھی نیلے آسمان کو، رب نے شاید اس کی دعاؤں کو قبول کر لیا تھا۔ شدت جذبات سے اس کی آنکھیں ایک نئے جوش و ولولے سے چمک اٹھیں۔

"رمیز بھائی کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"ہاں ہاں اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" رمیز نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا تو اس کا جی چاہا کہ رمیز بھائی کے ہاتھوں کو چوم لے مگر وہ ایسا نہ کر سکا کیونکہ وہ تو مٹی کے تیل میں اٹا ہوا تھا اور رمیز

صاف ستھرے یونیفارم میں ملبوس بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

"ہاں تو پڑھو گے کل سے ؟" رمیز نے ٹھوس جواب جاننا چاہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہ پڑھوں گا۔ پڑھنے سے تو زندگی ہے۔ میں ضرور پڑھوں گا۔"

"مگر آپ مجھے پڑھانا کیوں چاہتے ہیں؟" ایک سوال جو اس کے ذہن میں کافی دیر سے مچل رہا تھا بالآخر زبان پر آ ہی گیا۔

"میں کیوں پڑھانا...... چاہتا ہوں، بھئی دراصل بات یہ ہے کہ میں دسویں جماعت کا طالب علم ہوں اور اس دفعہ محکمۂ تعلیم نے یہ حکم جاری کیا ہے کہ ہر دسویں جماعت کا طالب علم کسی ناخواندہ کو خواندہ بنائے گا اس کے بغیر اسے سند نہیں ملے گی۔"

"مگر یہ حکم جاری کیوں کیا گیا ہے؟" لالو نے سوال داغا۔

"بھئی دراصل اپنے پاکستان میں بہت کم لوگ پڑھے لکھے ہیں جس کی وجہ سے ہمارا ملک تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہے بس اس لئے یہ حکم جاری ہوا ہے۔" رمیز نے تفصیل بتائی تو لالو کی سمجھ میں ساری بات آگئی اور اس نے دل ہی دل میں حکومت کو لاتعداد دعائیں دے ڈالیں۔

اگلے روز مقررّہ وقت پر رمیز لالو کو قاعدہ پڑھا رہا تھا اور لالو تو جیسے خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا وہ اتنا ذہین تھا کہ رمیز کو اس پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔

وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی برسوں پرانی خواہش اس طرح بھی پوری ہو سکتی ہے۔ رمیز نے ہی اسے کاپیاں کتابیں لا کر تھما دی تھیں اور وہ تو جیسے زمین پر ٹک ہی نہیں رہا تھا رمیز مسلسل پانچ روز سے وسطی پارک میں بیٹھ کر بڑی باقاعدگی سے اسے پڑھا رہا تھا۔

"اوئے لالو تو کیا کسی سے پڑھ رہا ہے؟" استاد نے اسے کھانے کے وقفے میں دیر سے آتے دیکھ کر کہا۔

"ہاں استاد میں اب تھوڑی دیر سے ہی آیا کروں گا۔" لالو نے تمکنت سے جواب دیا۔

"تو پھر تیری اُجرت کم بنے گی سوچ لیو۔" استاد نے اسے تنبیہ کی۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" اس نے سوچا اگر ایک وقت کی روٹی نہ کھائی تو کم از کم علم تو وہ حاصل کر سکے گا اور جب علم حاصل کرلے گا تو شاندار مستقبل پر اس کا بھی تو حق ہو گا۔

مستقبل کے خوبصورت تانوں بانوں میں الجھنا اسے آج بہت اچھا لگا کیونکہ اب وہ خوبصورت خواب بھی دیکھ سکتا تھا خوبصورت باتیں بھی سوچ سکتا تھا ہاں اسے اب یقین تھا کہ یہ ڈانگری جو اس نے اپنے جسم پر

چڑھائی ہوئی ہے یہ کچھ عرصے بعد ہمیشہ کے لئے اتر جائے گی اب اس کے ہاتھوں میں کالے کالے دھبے نہیں بلکہ خوبصورت قلم ہوگا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ کل کا دیا ہوا سبق دل ہی دل میں دہرانے لگا۔

آج وہ کھانے کے وقفے میں روٹی کھانے کے بعد رمیز کے انتظار میں محو تھا مگر جانے کیوں رمیز آج آیا ہی نہیں تھا کافی دیر انتظار کے بعد اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا رمیز نے شاید آج چھٹی کرلی تھی۔ انتظار کے صبر آزما لمحوں کو گزار کر وہ واپس ورکشاپ کی سمت بڑھ رہا تھا۔

اور پھر یونہی دو دن، تین دن گزرے اور ہفتہ بھی گزر گیا مگر رمیز کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ شاید وہ اسے بھول گیا ہو۔ دل نے سرگوشی کی تو دماغ نے فیصلہ بھی سنا دیا کہ کیوں نہ اس کے اسکول جاکر دیکھا جائے۔

اس فیصلے کے بعد وہ قریبی اسکول کی طرف چل دیا وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً رمیز اسے دیکھتے ہی شرمندہ ہو جائے گا اور پھر روز آنے کا وعدہ بھی کرلے گا۔

دفعتاً اس کی نظر رمیز پر پڑی جو گولہ گنڈا کھانے میں مصروف تھا۔

"رمیز بھائی رمیز بھائی۔" اس نے خوشی میں دور سے ہی آواز لگائی جواب میں رمیز نے بھی گرمجوشی سے ہاتھ ہلایا تو جیسے اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ ایک دفعہ پھر اس کی منزل جو نظروں سے اوجھل ہونے کو تھی، مل رہی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچا اور دل کا شکوہ فوراً ہی زبان پر لے آیا۔

"آپ آئے کیوں نہیں پڑھانے؟ میں کتنے روز سے انتظار کر رہا تھا۔"

"وہ دراصل لالو ہوا یہ کہ ہمارے اسکول میں اب اس شرط پر زیادہ سختی نہیں ہو رہی ہے کہ ناخواندہ کو خواندہ بنایا جائے اس لئے میں نے کہا چھوڑو رہنے دو۔ کیا فائدہ اپنا وقت ضائع کرنے سے۔" اور لالو کے دل میں تو جیسے چھناکے سے کچھ ٹوٹ پڑا۔

"تو کیا تعلیم دینے سے وقت ضائع ہوتا ہے؟" اس نے دبی دبی سرگوشی میں سوال کیا مگر رمیز تو اپنے دوست کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دور جاچکا تھا اور لالو ایک دفعہ پھر شکوہ بھری نگاہیں آسمان پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔ آنکھوں کے گوشے پوری طرح بھیگ چکے تھے اور اب وہ بوجھل بوجھل قدموں سے ورکشاپ کی سمت بڑھ رہا تھا جہاں استاد کے روپ میں وہ مستقبل کی آنکھوں سے اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا مٹی اور تیل میں اٹا ہوا۔

پرندے

شین فاروقی

صرف پرندے ہی اڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ کئی اور حیوانات ایسے ہیں جو اُڑ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سے کیڑے مکوڑے اور چمگادڑیں، جو کہ پرندوں کے بجائے دودھ پینے والے حیوانات کی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح اڑنے والی مچھلیاں لہروں کے اوپر تھوڑی دور تک پرواز کر سکتی ہیں۔ دنیا کے بعض خطّوں میں اڑنے والے گرگٹ اور اڑنے والی گلہریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ دوسرے حیوانات کے برعکس صرف پرندوں کو اللہ تعالیٰ نے

پرندے اپنے پروں کو جھپک کر ہوا کو نیچے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح خود اوپر اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

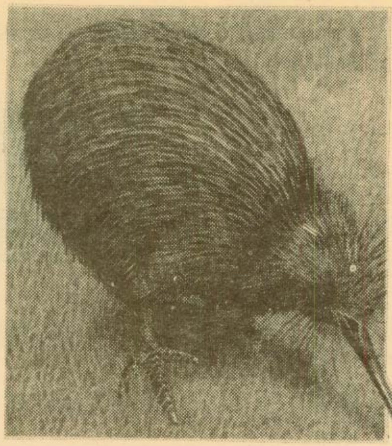

پینگوئن پروں کے چھوٹے ہونے کے باعث اڑ نہیں سکتی۔ اس کی لمبی چونچ اسے اپنی غذا کریدنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ بغیر رکے اونچے اونچے پہاڑوں اور سمندر کو عبور کر سکتے ہیں۔ کچھ پرندے تو ایسے ہوتے ہیں جو فضا ہی میں کھاتے پیتے ہیں یہاں تک کہ سوتے بھی ہیں۔

البتہ پرندوں کی نسل کے سب حیوانات اُڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر شترمرغ جس کے پر بہت ہی کمزور ہوتے ہیں۔ قدرت نے شترمرغ کے پروں کی کمزوری کو اس کے مضبوط پیروں سے پورا کیا ہے جن کے ذریعہ وہ بہت تیز دوڑ سکتا ہے۔ اسی طرح پینگوئین پانی کے اندر اپنے پروں سے تیرنے کا کام لیتی ہے۔

جو چیز پرندوں کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کے پر ہیں۔ پرندوں کے پاس دو

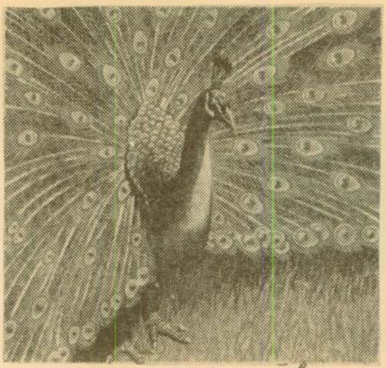

جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟

طرح کے پر ہوتے ہیں۔ سخت اور نرم۔ سخت پر انہیں اڑنے میں مدد دیتے ہیں جبکہ نرم پر انہیں گرماہٹ فراہم کرتے ہیں۔

پرندے ہر جگہ رہ سکتے ہیں۔ تاہم پرندوں کی ہر قسم ایک خاص جگہ پر رہنا پسند کرتی ہے۔ دراصل پرندوں کی رہائش کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کی غذا استعمال کرتے ہیں۔ آپ پرندوں کی چونچ اور پیروں کی ساخت کو دیکھ کر آسانی کے ساتھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس مقام پر رہتا ہو گا۔؟ زمین پر رہنے والے پرندوں کی غذا کیڑے مکوڑے اور اناج ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے پاؤں چھوٹے ہوتے ہیں تاکہ وہ آسانی کے ساتھ درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ سکیں اور زمین پر چل سکیں۔ کیڑے مکوڑے کھانے والے پرندوں کی چونچ چھوٹی اور بہت تیز ہوتی ہے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ کیڑے مکوڑوں کو پکڑ سکیں۔ اسی طرح اناج کھانے والے پرندوں کی چونچ بہت مضبوط ہوتی ہے

تاکہ وہ اناج کو آسانی کے ساتھ توڑ سکیں۔ باز اور عقاب چونکہ دوسرے پرندوں اور چوہوں وغیرہ کا شکار کرتے ہیں اس لئے ان کی چونچ خم دار ہوتی ہے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ ان کے ٹکڑے کر کے انہیں کھا سکیں۔

بہت سے پرندے سمندر، ندیوں اور جھیلوں کے نزدیک رہتے ہیں۔ پانی کے ان پرندوں کے پاؤں چھوٹے ہوتے ہیں جو انہیں تیرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان پرندوں کے پیروں کی انگلیوں کے درمیان جھلّی ہوتی ہے جو ان کے لئے چپّو کا کام دیتے ہیں اور گہرائی میں غوطہ لگانے میں معاونت کرتے ہیں۔ یہ پرندے مچھلیاں اور سمندر کے دیگر حیوانات کو غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے شکار کے اجسام چکنے ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کی چونچوں میں چھوٹے چھوٹے دانت سے رکھے ہوئے ہیں جو ان پرندوں کو اپنے شکار پر گرفت مضبوط کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

جن مقامات پر غذا کی قلت نہیں ہوتی وہاں پرندے جُھنڈ کی شکل میں رہتے ہیں۔ لیکن اگر غذا کی قلت ہو تو پھر پرندے انفرادی زندگیاں گزارتے ہیں۔ پرندوں کے دشمن دوسرے پرندے ہی ہوتے ہیں۔ جو پرندے جُھنڈ میں زندگی گزارتے ہیں عام طور پر اپنے دشمنوں سے زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ البتہ جھنڈ سے جدا ہو کر زندگی گزارنے والے پرندے آسانی کے ساتھ اپنے دشمن کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ تاہم یہ پرندے بھی اپنی پوری حفاظت کرتے ہیں۔ ان پرندوں میں سے اکثر کے رنگ بھورے اور ہرے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ پتوں میں چھپ جائیں تو ان کے دشمن انہیں آسانی کے ساتھ تلاش نہیں کر سکتے۔ تاہم کچھ پرندے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دشمن کا آمنے سامنے ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ چڑیا بڑا سا منہ کھول کر فضا میں اڑتے ہوئے کیڑوں کو کھا جاتی ہے۔

شکرے کی یہ نوکدار چونچ سخت سے سخت پھل کو توڑ سکتی ہے۔

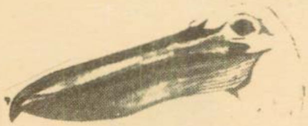

یہ آبی پرندہ اپنی تھیلے جیسی چونچ کو مچھلی پکڑنے کے لئے جال کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

اکثر الو رات کے وقت شکار کرتے ہیں۔ وہ معمولی روشنی میں دیکھنے اور بہت معمولی آواز سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو انہیں شکار کھیلنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

کھٹ بڑھیا اپنی تیز چونچ سے درختوں میں مہارت اور برق رفتاری کے ساتھ سوراخ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

گولڈن ایگل کی مڑی ہوئی مضبوط چونچ شکار کو چیرنے پھاڑنے کے کام آتی ہے۔

تمام پرندے انڈے دیتے ہیں اور اکثر پرندے ہر سال اپنے بچوں کی پرورش کا کام انجام دیتے ہیں۔ عام طور پر جب غذا کی قلت نہیں ہوتی تو پرندے لازماً بچوں کی پرورش کا کام انجام دیتے ہیں۔ سرد مقامات پر پرندوں کے بچوں کی پیدائش عام طور پر موسمِ بہار اور گرمیوں میں ہوتی ہے جبکہ گرم مقامات پر پرندے برسات یا خشک موسم میں بچے پیدا کرتے ہیں۔

اکثر پرندے اپنے انڈوں کو گرم رکھنے کے لئے انہیں سیتے ہیں۔ انڈوں کے اندر پرندے کا بچہ دن بدن بڑھتا رہتا ہے اور ایک دن وہ انڈے کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ کچھ پرندوں کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی زمین پر چلنے یا پانی میں تیرنے لگتے ہیں۔ تاہم کچھ پرندوں کے بچے ابتدائی دنوں میں دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ اور ان کے پر بھی نہیں ہوتے۔ ایسے بچوں پر ان کے والدین توجہ دیتے ہیں اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔ جب بچے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ چل پھر سکیں یا اڑ سکیں اور اپنی غذا خود تلاش کر سکیں تو ان کے والدین انہیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

جب کسی مقام پر غذا کی قلت ہو جاتی ہے تو اکثر پرندے دوسرے مقامات کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ کچھ پرندے ایک ہی ملک میں کسی ایک مقام سے دوسرے مقام پر چلے جاتے ہیں جبکہ کچھ پرندے ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں بلکہ دوسرے برِّاعظموں کو ہجرت کر جاتے ہیں۔ تاہم کچھ پرندے ایسے ہوتے ہیں جو ہجرت نہیں کرتے۔ یہ پرندے کسی خاص غذا کی قلت کے زمانے میں دوسری طرح کی غذائیں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اور یوں ساری زندگی ایک ہی مقام پر زندگی گزار دیتے ہیں۔

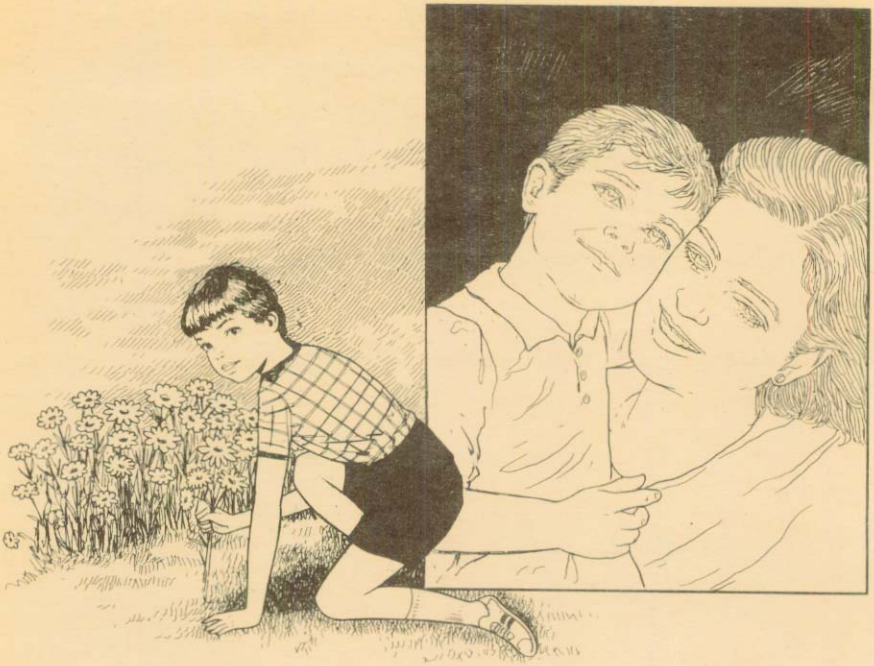

پھول اور امّی ابّو

چھوٹے بچوں کے لیے چھوٹی سی کہانی

سلیم مغل

ماجد ابھی بہت چھوٹا تھا اس لئے اسکول نہیں جاتا تھا۔ البتہ ماجد کے دونوں بہن بھائی رشیدہ اور امجد اسکول جایا کرتے تھے۔ ان دونوں کے اسکول جاتے ہی امی کام میں مصروف ہو جاتیں امی کو کام میں مصروف دیکھ کر ماجد کے مزے آجاتے۔ بگڑے ہوئے نوابوں کی طرح وہ گھر میں، جو چاہتا وہ

کرتا۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہ ہوتا۔ امی ماجد کو اس کی شرارتوں پر محض یہ سوچ کر کچھ نہ کہتیں کہ ابھی وہ بہت چھوٹا ہے۔ گھر کی چیزوں کی توڑ پھوڑ اور اٹھا پٹخ تو ماجد کے پسندیدہ کام تھے۔

یوں تو امی ماجد کو کچھ نہ کہتیں مگر ایک روز جب ماجد نے کیاری کے سب پھول توڑ لئے اور پوری کیاری پھولوں کے بغیر بے رونق سی لگنے لگی تو امی نے پہلے تو ماجد کو ڈانٹا مگر پھر بعد میں اسے سمجھایا کہ بیٹا پھول نہیں توڑنے چاہئیں۔

پھول کیوں نہیں توڑنے چاہئیں امی؟ ماجد نے جھٹ سے سوال کر دیا۔ امی نے ماجد کو سمجھانے کی خاطر بتایا،

"بیٹا یہ جو پتے اور ٹہنیاں ہوتی ہیں۔ یہ پھول کے امی ابو ہوتے ہیں۔ اگر پھولوں کو ان کے امی ابو سے جدا کر دیں تو انہیں بہت دکھ ہوتا ہے۔"

"امی دکھ کیا ہوتا ہے۔؟"

ماجد نے فوراً ہی ایک اور سوال کر دیا۔

امی پریشان ہو کر رہ گئیں کہ آخر اس چھوٹے سے بچے کو کیسے سمجھائیں کہ دکھ کیا ہوتا ہے؟ امی نے سمجھانے کی کوشش تو کی مگر ماجد کی کچھ سمجھ میں آیا، کچھ نہ آیا۔ یوں بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ محلے کی مسجد سے ایک بچے کی گمشدگی کا اعلان ہوا۔ جو بچہ کھویا تھا وہ ماجد کا بھی دوست تھا۔ ماجد جب اپنی امی کے ساتھ اپنے دوست کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے دوست کی امی اپنے بیٹے کی جدائی کے غم میں رو رہی ہیں۔ اور لوگ اسے دلاسہ دے رہے ہیں۔ تب ماجد کی سمجھ میں آیا کہ "دکھ" کا کیا مطلب ہے۔ اسے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ جب کسی کو اس کے امی ابو سے جدا کر دیں تو اسے کتنا دکھ ہوتا ہے...... پھر جب ماجد کا کھویا ہوا دوست مل گیا تو اس کی امی خوشی سے ایسے کھل گئیں جیسے کیاری میں پھول کھلا ہو۔

دوسرے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ماجد کی امی نے دیکھا کہ ماجد کیاری کے پودوں کے قریب بیٹھا ہوا پودوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔ امی نے چھپ کر اس کی آواز سنی تو وہ کہہ رہا تھا۔

"میرے پیارے پودو! اب میں تم سے تمہارے پھول بچوں کو کبھی جدا نہیں کروں گا۔"

اب ماجد کی کیاری میں خوب پھول آتے ہیں اور وہ انہیں کچھ نہیں کہتا۔ ماجد کی کیاری پھولوں سے سجی رہتی ہے۔ اور اس کا گھر پھولوں کی خوشبو سے مہکتا رہتا ہے۔

عیدی

منیر احمد راشد

"شجّو بھیا کو اب تک آجانا چاہئے تھا ماں۔ رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔" مُنّی کی پریشان آواز نے ماں کو چونکا دیا جو دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ "ہاں آ تو جانا چاہئے تھا۔" اس نے مُنّی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ پھر اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "اری چاند رات ہے ناں آج۔ اور اسے آج ہفتہ بھی تو ملنا تھا۔ سیٹھ سے پیسے ویسے لینے میں دیر ہو گئی ہو گی............ چل تو کھانا کھالے اور سو جا۔ کل عید ہے ناں! صبح کو جلدی اٹھنا پڑے گا۔ چل سو جا شاباش۔" مُنّی نے کوئی جواب تو نہ دیا البتہ وہ وہاں سے گئی بھی نہیں۔ بس ماں کے پاس بیٹھی خالی خالی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

یہ ایک کمرے کا مکان ہے۔ جس کی دیواریں اور چھت سرکنڈوں کی بنی ہوئی ہے۔ عرف عام میں

اسے جھونپڑی کہتے ہیں۔ اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا سرکاری میدان یہاں بنی ہوئی سینکڑوں جھونپڑیوں کا مشترکہ صحن ہے۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگ صرف بیس فٹ چوڑی سڑک کے اس پار بننے والی نو آباد ماڈرن کالونی میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ مرد دن بھر اس کالونی کے مکانات کی تعمیر اور زیبائش و آرائش میں مصروف رہتے ہیں اور عورتیں کوٹھیوں میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہیں۔ مُنّی کی ماں بھی سامنے ہی ایک کوٹھی میں کام کرتی ہے۔ مُنّی کا باپ تو مدت ہوئی فوت ہو چکا ہے۔ وہ چار منزلہ عمارت کی آخری منزل پر جھولے میں لٹکا ہوا پانی کی پائپ لائن فٹ کر رہا تھا کہ اچانک توازن بگڑ جانے کی وجہ سے نیچے سڑک پر گرا اور مر گیا۔

شجّو کی عمر اب بارہ سال تھی۔ وہ اپنے باپ کے ایک دوست چاچا رفیق کے ساتھ ہیلپری کرتا تھا۔ مُنّی اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ اور ماں کے ساتھ سامنے والے بنگلے میں جاتی تھی۔ جہاں صفائی کا ہلکا پھلکا کام کر دیتی تھی۔ ورنہ اکثر ماں کے ساتھ رہتی۔ اس طرح ان کی دال روٹی چل رہی تھی۔

رفیق چاچا ایک تعمیراتی ادارے میں پلمبر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ انہیں تو تنخواہ مہینے کے مہینے ملتی تھی مگر وہ شجّو کو ہر ہفتے خرچہ دے دیا کرتے تھے۔ ڈیڑھ سو روپے ہفتہ۔ اور آج شجّو کو ہفتے کا خرچہ لے کر ہی آنا تھا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اس کی ماں بہن بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

.... ○ ....

سڑک پر ایک دم ایسا شور مچا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ مگر وِکی کو معلوم تھا کہ یہ زلزلہ صرف اس کے گھر آئے گا۔ اور وہی ہوا سارے کا سارا شور اس کے بنگلے کے گیٹ پر آکر ٹھہر گیا۔ یہ عامر، سہیل اور کامران تھے۔ وِکی کے دوست اور ہم جماعت، جو اس وقت اپنی موٹر سائیکلوں کے سائیلنسر گھر پر رکھ کر انہیں سڑکوں پر پھٹپھٹاتے پھر رہے تھے اور اب وکی کو اپنی ٹولی میں شامل کرنے کے لئے اسے لینے اس کے گھر آئے تھے۔ ان کے شور کی وجہ سے بنگلے کے سامنے، سڑک کی دوسری طرف موجود جھونپڑیوں میں سے بہت سے بچے اور بڑے نکل کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ مُنّی بھی اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی انہیں حیرت سے تک رہی تھی۔ مگر وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر ایکسیلیٹر دبائے چلے جا رہے تھے۔ وکی بھی پہلے سے تیار ہو کر بیٹھا تھا، فوراً اپنی بائیک اسٹارٹ کر کے ان سے آن ملا۔ آتے ہی اس نے باری باری تینوں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر زور سے ہاتھ مارا اور سب نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا............

"آج مزا آئے گا ڈرائیونگ کا............ خوب ریس لگے گی۔" کامران نے ہنستے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ہاں آج پتہ چلے گا کون ماسٹر ہے۔" وکی نے بھی اس کی تائید کی۔ اور پھر چاروں دوست شور مچاتی اسپورٹس موٹر سائیکلوں پر وہاں سے روانہ ہوئے۔ رستے میں عامر نے پوچھا۔

"بھئی پروگرام کیا ہے............ کہاں کہاں چلنا ہے............ آج تو ساری رات اپنی ہے۔"

"رات تو ہر روز اپنی ہی ہوتی ہے...... مگر آج تو چاند رات ہے۔" وکی بولا۔

"چاند رات کو تو ایسے ہی منانا چاہئے جیسا کہ اس کا حق ہے۔" کامی نے کہا۔

"اور اس کا حق کیا ہے بھلا؟" سہیل نے ٹیڈی کٹ مارتے ہوئے اپنی بائیک کو سڑک پر لہرایا اور کامی کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔"

"اس کا حق............ خوشی، شادمانی، ہلّا گلّا، ہنگامہ............ ہاہاہا۔" کامی نے جھٹکے سے موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ ہوا میں اٹھاتے ہوئے قہقہہ لگایا اور اسکی دیکھا دیکھی باقی تین موٹر سائیکلیں بھی سدھائے ہوئے ریچھ کی مانند پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئیں۔ بلکہ دوڑنے لگیں۔

یہ لوگ اسی طرح ہلّا گلّا کرتے شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے طارق روڈ پر جا نکلے۔ جہاں عید کی خریداری کے لئے آنے والے لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔ دور دور تک رنگ برنگی روشنیوں کا سیلاب تھا۔ سڑک پر اور دکانوں میں رنگارنگ ملبوسات پہنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ کاروں، موٹر سائیکلوں اور انسانوں کا ملا جلا شور۔ عجیب ہنگامہ تھا۔ چاروں دوست ایک کولڈ کارنر پر آئس کریم کھانے کے لئے رکے جہاں پہلے بھی خاصے لوگ آئس کریم سے شغل فرمارہے تھے۔ اور آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ ایک بڑے میاں کہنے لگے۔

"دیکھو ہر کوئی کیسا خوش ہے۔ جیسے عید پر بس اسی کا حق ہے۔ حالانکہ عید تو انہیں کی ہوتی ہے جنھوں نے روزوں کی آزمائش میں کامیابی حاصل کی ہو۔ ان لوگوں میں سے اکثر وہ ہیں جنھوں نے ایک دن کا بھی روزہ نہیں رکھا ہو گا۔ مگر عید منانے کے لئے............ دیکھ لو کیسے لگے پڑے ہیں تیاریوں میں۔" چاروں دوستوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے اس بزرگ کے احمقانہ خیال پر انہیں ہنسی آرہی ہو۔ کولڈ کارنر سے ذرا آگے آکر وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ کامی نے کہا،

"بے چارے بڑے میاں............ سمجھتے ہیں عید انہیں کی ہوتی ہے جن کے روزے ہوں

.... بے چارے کو پتہ نہیں کہ عید تو اس کی ہوتی ہے جو عید منا سکے، جو انجوائے کر سکے .... جیسے ہم۔"

"ارے بڑھاپے میں سب ایسے ہی نیک بن جاتے ہیں۔ ضرور بچپن میں انہوں نے بھی ہماری طرح انجوائے کیا ہو گا۔ بغیر روزے رکھے۔ اور اب جب بڑھاپے میں روزے رکھنے کے علاوہ کچھ کر نہیں سکتے تو چاہتے ہیں کہ کوئی انجوائے ہی نہ کرے۔" سہیل نے اپنی دلیل پیش کی۔

"اگر بڑے میاں کا فارمولا مان لیا جائے تو عید پر ہم میں سے کسی کا بھی حق نہیں بنتا .... بس شجّو کا بنتا ہے۔" وکی نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"یہ شجّو کون ذات شریف ہیں بھئی۔" عامر نے وِکی کے برابر آتے ہوئے پوچھا۔"ہمارے بنگلے میں کام کرنے والی ماسی کا بیٹا ہے۔ ماسی اس کی بہت تعریف کرتی ہے۔" "ہونہہ! میں سمجھا کوئی نیا دوست ہے۔" کامی نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ لوگ اب طارق روڈ سے نکل کر صدر کی طرف جا رہے تھے۔ اور ان کی موٹر سائیکلوں کے شور کی وجہ سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ کچھ غصے اور نفرت سے انہیں دیکھتے۔ کچھ بے بسی سے اور کوئی کوئی ایسا بھی تھا جو مسکرا کر انہیں دیکھتا اور دل میں سوچتا کہ عید تو ان لوگوں کی ہے بھئی۔

چاروں اب صدر پہنچ چکے تھے پھر جیسے ہی وہ ایمپریس مارکیٹ کی طرف مڑے تو اچانک دس بارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا وکی کی موٹر سائیکل کی زد میں آ گیا۔ موٹر سائیکل سے ٹکرا کر وہ لڑکا سڑک پر گرا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپر موٹر سائیکل کے پچھلے پہیئے میں پھنس گیا۔ چاروں دوست رک گئے۔ اِدھر اُدھر سے دوسرے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ مگر معاملہ اتنا سیریس نہیں تھا۔ موٹر سائیکل سے ٹکرا کر گرنے والا لڑکا فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے اپنی چوٹوں سے زیادہ اس شاپر کی فکر تھی جو کہ وہیل میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ لپک کر موٹر سائیکل کی طرف آیا۔ اور روتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرا سوٹ .... میرا سوٹ۔" اور بے تابی سے شاپر کو وہیل سے جدا کرنے کی کوشش کرنے لگا جو بُری طرح اس میں الجھ گیا تھا۔ وکی نے فوراً اسے پہچان لیا۔ یہ شجّو تھا۔ ان کے گھر میں کام کرنے والی ماسی کا لڑکا .... اسے دیکھ کر وکی کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ اب بہت مار پڑے گی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے حالات میں چوٹ کھانے والے سے زیادہ دیکھنے والے مشتعل ہوتے ہیں۔ اور بلا سوچے سمجھے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جلدی سے موٹر سائیکل کھڑا کر کے شجّو کے پاس

آیا۔ اور ہمدردی سے پوچھنے لگا۔

"شجّو چوٹ تو نہیں لگی؟" شجّو نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اپنی چوٹ کو بھول کر اس نے ہاتھ اٹھا کر وکی کو سلام کیا اور حسرت سے شاپر کی طرف دیکھنے لگا۔ وکی اسکا اشارہ سمجھ گیا۔ بولا،

"اچھا اچھا ابھی نکالتا ہوں۔" پھر وہاں جمع ہونے والے لوگوں سے بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، نو پرابلم، یہ ہمارا ملازم ہے۔" اور بیٹھ کر وہیل سے شاپر علیحدہ کرنے لگا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اس دوران زور آزمائی کی وجہ سے شاپر اور اس کے اندر موجود ایک بچکانہ سوٹ کی دھجیاں بکھر گئیں۔ کچھ کانچ کی چوڑیاں ٹکڑوں کی صورت میں بکھری پڑی تھیں۔ جنہیں پاس کھڑا ہوا شجّو بڑی حسرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اسکی پلکوں میں آنسو اٹکے ہوئے تھے اور لب خاموش۔ شاید وہ اپنے دُکھ کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وکی نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا،

"تم فکر نہیں کرو۔ کل میں ممی سے کہہ کر تمہیں اس کے پیسے دلوادوں گا۔" شجّو کچھ نہ بولا۔ بس گردن ہلا کر رہ گیا۔

تقریباً آدھی رات بیت چکی تھی۔ مُنّی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اسے کے برابر ہی دوسری طرف کروٹ لئے شجّو بھی زمین پر پڑا تھا۔ مُنّی جانتی تھی کہ شجّو بھی ابھی تک نہیں سویا ہے۔ ذرا فاصلے پر ماں لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے خراٹوں کی مدہم آواز اس کے بے خبر سونے کی خبر دے رہی تھی۔ مُنّی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بڑے پیار سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جو اسے بتائے بغیر اس کے لئے نیا سوٹ خرید کے لانے والا تھا تاکہ عید پر وہ بھی نئے کپڑے پہن سکے۔ منی نے پچھلی عید کے بعد سے نئے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً امی سے نئے کپڑوں کی فرمائش کرتی رہتی تھی جسے آج اس کے بھائی نے پورا کرنا چاہا تھا مگر وکی کی وجہ سے اس کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے سے رہ گئی تھی۔ اس غم میں اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اور کھانے کو تھا بھی کیا۔ دوپہر کی سوکھی روٹیاں۔ مگر............ اسے وکی پر بہت غصہ آرہا تھا۔ وکی کا خیال آتے ہی اس کا دھیان موسیقی کی اس آواز کی طرف ہو گیا جو سامنے وکی کے بنگلے سے آرہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ شور مچاتی ہوئی چاروں موٹر سائیکلیں تھوڑی دیر پہلے بنگلے میں داخل ہوئی تھیں۔ اور اب وہ لوگ بنگلے کی اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں ناچنے گانے میں مصروف تھے۔ لگتا تھا آج کی رات وہ لوگ نیند کو اپنے پاس نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ اور خود نیند کی حالت یہ تھی کہ وہ منی کی آنکھوں میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے وہ جاگ رہی تھی اور اسے صبح تک تو جاگنا ہی تھا اور

ان ہی پرانے کپڑوں میں عید منائی تھی۔

وہ سوچنے لگی خدا کتنا نامہربان ہے۔ عید آتی ہے مگر نئے کپڑے نہیں آتے۔ انہی سوچوں میں نہ جانے کس وقت اسے نیند آگئی۔ صبح اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اسکے سرہانے کپڑے رکھے ہوئے ہیں نئے، نئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ چاہتی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا کا شکر ادا کیا اور رات کی کہی اس بات پر خدا سے معافی مانگی۔ اور پھر وہ اٹھ کر عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

شجو نے بمن کو دیکھا تو مسکرایا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وکی کے سینے میں بھی ایک درد مند دل ہے۔

عازمین حج
متوجّہ ہوں

خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اللہ نے حجازِ مقدّس کے سفر کے لیے منتخب کرلیا۔
اِس سال فریضۂ حج کی ادائیگی پر جانے والے تمام حجّاج کی خدمت میں ضمیر الدّین میموریل آرگنائزیشن ایک ایسا تحفہ پیش کررہی ہے جو سفرِ حج اور مناسکِ حج کے دوران اُن کے لیے بہترین زادِراہ ثابت ہوگا۔
جناب شیخ ضمیر الدّین احمد (مرحوم)، کی تالیف کردہ کتاب "سَفَرِ مُبارَک" بلا قیمت حاصل کرنے کے لیے فریش و یل سُوئیٹس. کراچی کے کسی بھی پوائنٹ پہ اپنی حج کی دستاویزات دکھاکر یہ کتاب مُفت حاصل کی جاسکتی ہے۔

رشوت

شاھنواز فاروقی

افسر ہے، نہ ابّا ہیں، نہ بھیّا ہیں نہ بھابی
رشوت ہے حقیقت میں ہر اک کام کی چابی

دنیا کا ہر اک کام نکل جاتا ہے اِس سے
دل چیز ہے کیا، سنگ پگھل جاتا ہے اِس سے

ساتھی ہے یہ ہر حال میں ساتھی سے زیادہ
قوت ہے میّسر اِسے ہاتھی سے زیادہ

جس کام کو رشوت کا سہارا نہیں ملتا
اُس کام کی کشتی کو کنارہ نہیں ملتا

بارے میں ہے رشوت کے یہ اک رائے بہت عام
رشوت سے جدا ہوتے ہی دنیا کا ہر اک کام

گر موت سے بچ جائے گا، غش کھانے لگے گا
بد شکل سا ہو جائے گا لنگڑانے لگے گا

بازار میں دنیا کے کئی رنگ ہیں اِس کے
جو ڈھنگ ہیں ابلیس کے وہ ڈھنگ ہیں اِس کے

محشر میں مگر اِس کے سبھی رنگ ڈھلیں گے
اُس روز تو اعمال کے سکّے ہی چلیں گے

خوفناک جنگ، خطرناک ہتھیار

سیّد طارق محمود

دوستو! جنگ اچھی چیز نہیں۔ یہ اپنے ساتھ تباہی و بربادی لاتی ہے۔ عراق اور کثیر القومی افواج کے جدید جنگی سامان کے بارے میں زیر نظر مضمون صرف اس مقصد سے پیش کیا جارہا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے بغیر کوئی قوم اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتی۔ سائنسی تحقیق و جستجو ہی وہ راستہ ہے جو خوشحالی کے ساتھ ساتھ بقاء کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔

ایک دور تھا جب جنگیں تیروں، تلواروں اور نیزوں سے لڑی جاتی تھیں۔ چین میں بارود کی ایجاد کے بعد آتشی ہتھیاروں کی ابتداء ہوئی۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا نئے قسم کے ہتھیار تیار ہوتے گئے۔ انسان نے بندوقیں ایجاد کیں، توپیں بنائیں، طمنچے اور پستول استعمال ہونے لگے۔ بیسویں صدی میں دو عالمی جنگیں لڑی گئیں۔ ان جنگوں کے دوران سائنس دانوں کی تمام تر توجہ مہلک ہتھیار ایجاد کرنے پر صرف ہوئی جس کے نتیجے میں ٹینک ایجاد ہوا، جدید اور خطرناک خود کار رائفلیں تیار کی گئیں، دور تک گولہ پھینکنے والی توپیں بنائی گئیں اور آخر کار ایٹم بم بنا کر استعمال کیا گیا۔

جنوری کے وسط میں شروع ہونے والی خلیجی جنگ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ہم نے دنیا کی مہنگی

ترین ٹکنالوجی کو جنگ کے میدان میں ایک ساتھ استعمال ہوتے دیکھا۔ ذیل میں اس جدید ترین دفاعی ٹکنالوجی اور مہلک ہتھیاروں کی ایک جھلک پیش کی جارہی ہے۔

کثیر القومی افواج کا اسلحہ خانہ

عراق کے خلاف لڑنے والی اتحادی افواج میں دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک کی فوجیں شامل تھیں اور دنیا کی بہترین دفاعی ٹکنالوجی بھی ان کے پاس تھی۔ کثیر القومی افواج کے بیشتر ہتھیار یا تو خود کار تھے یا کمپیوٹرائزڈ۔ یہ افواج زیادہ تر اپنے ہوائی جہازوں اور میزائلوں پر بھروسہ کرتی ہیں اور فضائی برتری کے ذریعے دشمن کی کمر توڑنا چاہتی ہیں۔ ان کے برق رفتار طیاروں اور میزائلوں میں کمپیوٹر نصب ہیں جو ہدف کا ٹھیک پتا لگا کر ان کو تباہ کر دیتے ہیں۔ خلیج میں موجود قریباً ڈھائی ہزار اتحادی طیاروں میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کو بم اور راکٹ برسانے کے لئے غوطہ لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ ہدف سے بہت پہلے کافی بلندی ہی سے بم یا راکٹ چھوڑتے ہیں جو خود سفر کر کے نشانہ پر گرتا ہے۔ اس طرح یہ طیارے دشمن کی طیارہ شکن توپوں (AAA) کی زد سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ڈاگ فائٹ (دوبدو جنگ) کی صورت میں طیارے کا پائلٹ محض ایک کمپیوٹر پروگرامر کا کردار ادا کرتا ہے۔ کمپیوٹر خود مخالف طیارے کو نشانے پر لیتا ہے اور پائلٹ کے بٹن دباتے ہی آناً فاناً اسے تباہ کر دیتا ہے۔

خلیجی جنگ میں انتہائی کامیابی سے استعمال ہونے والا قوی ہیکل بی ۵۲ بمبار طیارہ ہے جو تین دہائیوں سے امریکی جنگوں کا لازمی جزو رہا ہے۔ اب نئی ٹکنالوجی نے اس طیارے کو ایسی ترقی دی ہے کہ یہ اپنے ساتھ AGM — 142 میزائل لے کر اڑتا ہے جن کو اگر مطلوبہ نشانے سے اٹھاسی کلو میٹر دور بھی چھوڑا جائے تو یہ فضا میں پرواز کرتے ہوئے بقیہ سفر خود طے کرتے ہیں۔

امریکہ کا جدید ترین طیارہ ایف۔ ۱۱۷ اے اسٹیلتھ فائٹر ہے۔ چمگادڑ کی شکل کے اس ہوائی جہاز کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ طویل فاصلہ طے کر کے اپنے ہدف پر پہنچ جاتا ہے اور دشمن کے ریڈار کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ اس شاندار اور انتہائی کار آمد طیارے کی قیمت ۱۰۶ ملین ڈالر (دو ارب تینتالیس کروڑ اسّی لاکھ روپے) ہے۔

فوجی ماہرین کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ وہ ایسے اڑنے والے آتشی ہتھیار ایجاد کریں جن کو اپنے محفوظ ٹھکانوں سے داغا جائے اور وہ ٹھیک دشمن کے اہم مراکز پر گر کر ان کو تباہ کر سکیں۔ حالیہ خلیجی جنگ میں ہم نے ایسے خوفناک میزائل دیکھے جن کی کارکردگی حیران کن ہے۔ اتحادی فوجوں نے عراقی

تنصیبات کو برباد کرنے کے لئے ٹوموہاک میزائلوں کی بارش برسائی۔ محض جنگ کے ابتدائی چند گھنٹوں میں اتحادی بحری جہازوں اور آبدوزوں نے سو سے زائد کروز میزائل عراق کی طرف فائر کئے جبکہ صرف ایک کروز میزائل کی لاگت ۱ ملین ڈالر (دو کروڑ تیس لاکھ روپے) ہے۔ ٹوموہاک کروز میزائل ایک عام پسنجر ہوائی جہاز کی رفتار سے زیادہ سے زیادہ پچیس سو کلو میٹر کا سفر طے کر کے اپنے ہدف سے اٹھارہ میٹر کے دائرے میں گرتا ہے۔ اس میزائل کے اگلے سرے میں کیمرے اور کمپیوٹر نصب ہیں۔ یہ کمپیوٹر اپنے طے شدہ راستے کا پتا خود ہی لگاتا ہے اور اس دوران اپنے کیمرے سے مسلسل تصویریں کھینچتا رہتا ہے۔ یہ میزائل اپنی نیچی پرواز کی بدولت عراقی ریڈار سسٹم کی دسترس سے باہر تھا۔

عرصے سے زیر استعمال فیول ایئر بم اور کلسٹر بم کے علاوہ جدید ٹکنالوجی کا ایک شاہکار اسمارٹ بم ہیں۔ اس بم کی خصوصیت بھی یہ ہے کہ پائلٹ ان کو ہدف سے کافی دور کسی ایسے مقام پر فضا میں چھوڑ دیا جاتا ہے جہاں طیارے کو زمین سے مار کرنے والی طیارہ شکن توپوں (AAA) یا مدافعت کرنے والے دشمن کے طیاروں سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ یہ بم نہ صرف کہ نئے اقسام کے لڑاکا بمبار طیاروں میں لگائے جا سکتے ہیں بلکہ پرانے بی ۵۲ بمبار کے ذریعے بھی ان بموں کو نشانے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ ان بموں کا نشانہ حیرت انگیز طور پر صحیح ہے۔

امریکہ نے پہلے سعودی عرب اور پھر اسرائیل کی سرزمین پر پھینکے جانے والے عراقی اسکڈ میزائلوں کو فضا ہی میں تباہ کرنے کے لئے پیٹریوٹ (محبِ وطن) میزائل انتہائی کامیابی سے استعمال کئے۔ خلیجی جنگ سے پیشتر یہ ایک خفیہ ہتھیار تھا اور اسکا علم بہت کم لوگوں کو تھا لیکن اب اس کی کارکردگی سے ہر ایک واقف ہے۔ یہ ایک انتہائی مہنگا ہتھیار ہے اور صرف ایک میزائل کی قیمت ۱۲۳ ملین ڈالر (دو ارب بیاسی کروڑ نوے لاکھ روپے) ہے۔

ایک اسکڈ میزائل کو روکنے کے لئے عام طور پر دو پیٹریوٹ میزائل چھوڑے جاتے ہیں جبکہ ایک وقت میں ایک لانچنگ اسٹیشن چار میزائل تک داغ سکتا ہے۔ سب سے پہلے ریڈار کی مدد سے آنے والے اسکڈ میزائل کی سمت کا پتا لگایا جاتا ہے۔ پھر کمپیوٹر یا زمینی کنٹرول پر بیٹھا ہوا آپریٹر پیٹرائٹ میزائل لانچ کر دیتا ہے۔ زمینی ریڈار سسٹم کے ساتھ ساتھ پیٹریوٹ کے اگلے سرے میں لگا ہوا ریڈار اسکڈ میزائل کی صحیح پوزیشن کا تعین کرتا ہے اور چند ہی لمحوں میں پیٹریوٹ میزائل کا وارہیڈ (بارودی گوشہ) دشمن میزائل کے بالکل قریب جا کر پھٹ پڑتا ہے جس سے دشمن میزائل تباہ ہو جاتا ہے۔

جدید جنگوں میں سب سے اہم کردار گولہ بارود کا نہیں بلکہ الیکٹرونک اور کمپیوٹر ٹکنالوجی کا ہوتا ہے۔ جاسوسی، نگرانی اور مواصلات کا تو سارا نظام ہی پیچیدہ برقی آلات کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ ۳۲

ملین ڈالر (تہتر کروڑ ساٹھ لاکھ روپے) سے تیار کردہ الیکٹرونک جامنگ (Electronic Jamming) کا نظام خلیجی جنگ کا اہم ہتھیار تھا جس کی مدد سے کثیر القومی افواج نے عراق کے ریڈار سسٹم کی صلاحیت کو بڑی حد تک سلب کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی طرح رات کی تاریکی میں دیکھنے والے وہ آلات جو طیاروں اور ٹینکوں کے علاوہ زمینی فوج کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لئے بھی بے حد سود مند ہیں ستاروں کی مدہم روشنی میں پچیس ہزار گنا اضافہ کر کے انتہائی تاریک راتوں میں بھی گیارہ کلو میٹر دور تک کی چیزوں کو بھی واضح کر دیتے ہیں۔ ہوائی جہاز میں نصب ایک ایسے آلے کی قیمت تقریباً ۲ لاکھ ڈالر (چھیالیس لاکھ روپے) ہے۔

امریکہ کا نگرانی اور جاسوسی کرنے والا طیارہ اواکس اپنے مخصوص میدان میں کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ یہ اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر محو پرواز رہتے ہوئے اپنے اندر نصب طاقتور ریڈار اور سپر کمپیوٹر کی بدولت بارہ سو سے پندرہ سو کلو میٹر تک ہونے والی تمام نقل و حرکت کا پتا چلا لیتا ہے۔ چند سال پہلے امریکہ نے کچھ اواکس طیارے سعودی عرب کے ہاتھ فروخت کئے تھے جو **حالیہ** خلیجی جنگ کے دوران اتحادی فوجوں کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوئے ہیں۔

خلیج کی زمینی جنگ میں سب سے زیادہ اہمیت ٹینکوں کو حاصل تھی۔ جنگی ماہرین یہ توقع کر رہے تھے کہ عرب کے ریگستان میں ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ لڑی جانے والی ہے۔ کثیر القومی افواج کے پاس موجود تین ہزار تین سو ساٹھ ٹینکوں میں سے تقریباً ڈھائی ہزار ٹینک امریکی اور ایکسو سترّ برطانوی تھے پینتالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والا امریکہ کا ایم ون اے ون ابرام ٹینک ایک ایسے چلتے پھرتے قلعے کی مانند ہے جو نہ صرف اپنے ارد گرد کئی میل تک ہونے والی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے بلکہ ہر قسم کے حالات سے نبٹنے کی صلاحیت بھی اس کو حاصل ہے۔ اس ٹینک کی کمپیوٹر گن جس میں لیزر شعاؤں سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہی پہلی بار یہی نشانے پر بالکل ٹھیک گولہ پھینکتی ہے۔ اس ٹینک کی بنیادی خامیاں یہ ہیں کہ یہ بہت زیادہ پیٹرول کھاتا ہے (نو گیلن فی میل) اور پھر دشمن کی گولہ باری کے نتیجے میں اس کے پیچیدہ نظام میں پیدا ہونے والی ذرا سی خرابی اس کو ناکارہ بنا سکتی ہے۔ خلیج کی جنگ میں تقریباً پانچ سو چھیتّر ایم۔ اے ٹینک استعمال ہوئے۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ کا تباہ کن چیلنجر ٹینک بھی بہت کامیابی سے خلیجی جنگ میں استمال ہوا۔

خلیجی جنگ میں حصہ لینے والے ایک سو چھتر اتحادی بحری جہازوں پر ایک ہزار سے زائد ایٹمی ہتھیار موجود تھے جن میں سے چار سو کے قریب صرف امریکی جہازوں میں نصب تھے۔ یہ ایٹمی اسلحہ ضرورت پڑنے پر کسی وقت بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔

عراق کااسلحہ خانہ

آج سے صرف دس سال پیشتر عراق کے پاس اسلحہ بنانے کی انتہائی واجبی سی صلاحیت تھی۔ اس وقت عراق محض یوگوسلاویہ کی تیار کردہ ایک عام سی رائفل کی نقل تیار کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔ مگر موجودہ جنگ سے پہلے اس کے پاس دس لاکھ نفوس پر مشتمل دنیا کی چھٹی بڑی فوج اور ایک انتہائی خطرناک اسلحہ خانہ تھا۔ تیسری دنیا میں عراق، بھارت اور اسرائیل کے بعد خطرناک اسلحہ تیار کرنے والا تیسرا اہم ملک ہے۔ درا صل ایران سے دس سالہ جنگ کے دوران نہ صرف عرب ممالک نے بلکہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں نے عراق کو بے تحاشا اسلحہ اور دفاعی ٹکنالوجی فراہم کی۔ ۱۹۸۲ سے ۱۹۸۹ء کے دوران مغربی ملکوں نے عراق کو تیرہ اعشاریہ چار بلین ڈالر (تین کھرب آٹھ ارب بیس کروڑ روپے) کے فوجی ساز و سامان سے لاد دیا۔ جس کی قیمت ان کو حالیہ جنگ میں ادا کرنی پڑی۔

دنیا جانتی ہے کہ ٹکنالوجی کے میدان میں عراق کا امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ عراق نے جس اسلحہ کے بل بوتے پر جنگ لڑی ہے یہ سب کا سب مانگے تانگے کا تھا۔ عراق چونکہ کئی عشروں سے روسی بلاک میں شامل رہا ہے اسی لئے عراق کا زیادہ تر اسلحہ روسی ساخت کا تھا۔ اپنی دوستی کو نبھاتے ہوئے روس نے عراق کو کل بتیس اعشاریہ چار بلین ڈالر (سات کھرب پینتالیس ارب بیس کروڑ روپے) کا اسلحہ دیا جس میں جدید ترین اسلحہ بھی شامل تھا۔ بات یہ ہے کہ روسی ہتھیار معیار اور کارکردگی میں کسی طرح بھی مغربی ممالک کے بنائے گئے ہتھیاروں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے مہلک اسلحہ کی بنیاد پر عراق کے پاس انسانوں کو ہلاک کرنے کی بے پناہ صلاحیت ضرور موجود تھی لیکن وہ دشمن کے ٹھکانوں کا ٹھیک ٹھیک پتا لگانے اور ان کو تباہ کرنے سے محروم تھا۔

عراق کی تمامتر قوت اس کی زمینی فوج اور اسکا زمینی اسلحہ تھی۔ فضائی اور بحری میدانوں میں وہ اتحادیوں کے سامنے حد درجہ کمزور تھا۔ اس کے پاس تقریباً آٹھ سو طیارے تھے۔ جس میں روسی مگ ۲۱، مگ ۲۵ اور جدید ترین مگ ۲۹ طیارے شامل تھا۔ اس کے علاوہ عراق کے پاس فرانس کے میراج طیارے بھی موجود تھے۔ ایران عراق جنگ کے دوران عراق نے مصر سے چین کے بنائے ہوئے ایک سو دس ایف ۶ اور ایف ۷ طیارے بھی خریدے تھے۔ یہ طیارے ٹیکنیک اور مہارت میں امریکی اور برطانوی طیاروں کا مقابلہ نہیں کرتے۔

درحقیقت ایک لاکھ نفوس پر مشتمل وہ ریپبلیکن گارڈز (جمہوری محافظ) عراقی فوج کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے جن کے پاس چار ہزار آٹھ سو ٹینکوں پر مشتمل ایک عظیم اسلحہ خانہ تھا اس کے علاوہ

تقریباًپوری دنیااب اسکڈ میزائل کے نام سے واقف ہو چکی ہے۔ روس کا تیار کردہ یہ گیارہ میٹر لمبا میزائل دشمن کے ٹھکانوں کو تباہ کرنے کے معاملے میں اتنا کامیاب نہیں جتنا دہشت اور افراتفری پھیلانے میں کار آمد ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اسکڈ میزائل اپنے اصل نشانے سے دو کلو میٹر دور تک گرنے کی غلطی کر سکتا ہے میزائلوں کو مزید ترقی دے کر "العباس" کے نام سے ایسے میزائل تیار کئے گئے جن کی انتہائی حد پانچ سو چالیس میل ہے۔ گویا اب پورا خلیج فارس، اسرائیل اور مصر تک عراقی اسکڈ میزائلوں کی زد میں ہیں۔

ابتدائی اندازوں کے مطابق عراق کے پاس پانچ سو سے لیکر آٹھ سو اسکڈ میزائل، بتیس فکسڈ اسکڈ لانچرز اور کم از کم چھتیس ایسے موبائل (گشتی) لانچرز موجود تھے جو آٹھ پہیوں والے بڑے ٹرکوں میں رکھے جا سکتے ہیں۔ انہی موبائل لانچرز کو ہوائی حملوں کے ذریعے تباہ کرنا کثیر القومی فوجوں کے لئے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ کسی اسکڈ میزائل کو فائر کرنے سے پانچ گھنٹے قبل یہ موبائل لانچرز اپنی کمیں گاہوں سے باہر لائے جاتے تھے اور پھر فوراً چھپا دیئے جاتے تھے۔

ان اسکڈ میزائلوں میں یہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ یہ اپنے ساتھ روایتی بارود کے علاوہ ایٹمی، کیمیاوی اور جراثیمی مادہ بھی ہدف تک لے جا سکتے ہیں جو بالآخر ہزاروں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔

جراثیمی اور کیمیاوی ہتھیار بنانے کی عراقی صلاحیت بھی امریکہ، مغربی جرمنی اور اٹلی کی مرہون منت ہے۔ یہ انتہائی مہلک ٹکنالوجی مغربی ملکوں نے عراق کو ایران کے خلاف فراہم کی تھی۔ عراق اس سے پہلے ایرانیوں اور باغی کردوں کے خلاف کیمیاوی ہتھیار استعمال کر چکا ہے۔ عراق کی اسی صلاحیت نے امریکہ، اسرائیل اور اس کے دیگر اتحادیوں کو ایک مسلسل خوف میں مبتلا کئے رکھا۔ اسرائیل کے شہری، سعودی عرب کی مشرقی سرحد پر رہنے والے اور اتحادی فوجی اپنے ساتھ ہر وقت گیس ماسک رکھنے پر مجبور تھے تاکہ کسی کیمیاوی حملے کی صورت میں زہریلی گیسیں سانس کے ساتھ ان کے جسم میں داخل نہ ہو سکیں۔

کیمیاوی ہتھیار زمین پر گرنے کے بعد مختلف زہریلی گیسیں خارج کرتے ہیں جو انسانی جسم اور ذہن پر مختلف اثرات مرتب کرتی ہیں مثلاً مسٹرڈ گیس پورے جسم میں خارش اور سوزش پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ آبلے ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد پھیپھڑوں سے خون رسنا شروع ہو جاتا ہے اور جاندار آہستہ آہستہ موت کی وادی میں جا پہنچتا ہے۔ اس گیس کا اثر ایک سے لیکر دو گھنٹے تک رہتا ہے۔

سائنائیڈ گیس خون میں شامل ہو کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ انسان اپنا ذہنی توازن کھو دیتا ہے۔ غشی طاری ہوتی ہے۔ سانس لینے میں انتہائی مشکل اور سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ یہ گیس ایک گھنٹے تک

ماحول میں موجود رہتی ہے۔

مختلف اقسام کی اعصابی گیسیں انسان کے اعصابی نظام کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ یہ فوراً اثر انداز ہوتی ہیں اور انسان کو اپنے جسم کی حرکات پر قابو نہیں رہتا۔ جسم میں لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور بینائی متاثر ہوتی ہے۔

کیمیاوی حملے کے وقت اگر آدمی گھر سے باہر ہے اور اس کے پاس گیس ماسک بھی نہیں تو پھر اس کے بچنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں اور اس کا مرنا تقریباً یقینی ہے۔ البتہ گھر کے اندر ہونے کی صورت میں بچاؤ کی واحد صورت یہ ہے کہ انسان بہتے ہوئے پانی میں بیٹھ جائے یا تولیہ بھگو بھگو کر اپنے سر پھر رکھتا رہے۔ یہ زہریلی گیسیں پانی میں حل ہو جاتی ہیں۔

عراق کا ایک اور مہلک ہتھیار فیول ۔ ائیر آتشگیر بم ہے۔ فیول ۔ ایئر بم (FAE) جس کو اکثر غریبوں کا ایٹم بم بھی کہا جاتا ہے اس کی کارکردگی کو ایک ایسے کمرے کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں سوئی گیس بھر دی جائے اور پھر اچانک کمرے میں دیا سلائی جلا دی جائے۔ یہ بم فضاء میں ایک آتشی دھماکہ پیدا کرتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ارد گرد کا پورا ماحول آگ کے گولے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس گولے کی زد میں آنے والی ہر چیز فنا ہو جاتی ہے۔ نقصان اور تباہی کے لحاظ سے یہ بم نیوکلیئر بم یا ایٹم بم کا عشر عشیر بھی نہیں لیکن اس کا شکار فوجی نہ صرف اپنے کانوں کے پردوں سے محروم ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے اندرونی اعضاء پھٹ جاتے ہیں اور ان کے پھیپھڑے بیکار ہو جاتے ہیں۔ یہ بم ٹینکوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن ان کے مواصلاتی نظام کو تباہ کر سکتا ہے۔

عراق کی ایٹمی صلاحیت ایک متنازعہ بحث ہے۔ فرانس اور مغربی جرمنی سے نیوکلیئر ٹکنالوجی حاصل کرنے کے بعد عراق نے ایٹم بم کی تیاری شروع کر دی تھی مگر ۱۹۸۱ء میں اسرائیل نے عراق کے ایٹمی پلانٹ کو بمباری کر کے تباہ کر دیا۔ محتاط اندازوں کے مطابق جنگ سے پہلے عراق کے پاس ستائیس پونڈ تیار شدہ یورینیم ۲۳۵ موجود تھا۔ جس کی مدد سے وہ فوری طور پر ایک یا دو ایٹم بم بنا سکتا تھا۔ گو کہ اس تیاری کے لئے جس قسم کا پیچیدہ فنی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے بظاہر عراق کو اس کا کوئی تجربہ نہیں۔

بیسویں صدی کے آخری حصے میں لڑی جانے والی خلیجی جنگ میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کی تفصیل اور ان کی کارکردگی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد جدید روسی بحریہ کے بانی ایڈمرل سرجی گورشکیو کی پیشن گوئی یاد آتی ہے۔ گورشکیو نے کہا تھا "اگلی جنگ وہی جیتے گا جو برقی مقناطیسی طیف (الیکٹرانکس) کا بہتر استعمال کرنا جانتا ہوگا۔" جنگ کے نتیجے نے ظاہر کر دیا ہے کہ روسی ایڈمرل کی پیشن گوئی کس حد تک صحیح تھی۔

جب کشتی ڈوب گئی

شاہ نواز فاروقی

زوربن نے اپنی کشتی کو آخری آرائشی ٹچ دیا اور پھر ایک دوسرے شخص کے ساتھ ذرا دور ہٹ کر کشتی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو مصوّر کی آنکھوں میں اچھی تصویر بنانے کے بعد اور شاعر کی آنکھوں میں اچھا شعر لکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ کشتی مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ایک خوبصورت کشتی تھی۔ اتنی ہی خوبصورت جتنے کے وہ گیت تھے جو اسے بناتے ہوئے گائے گئے تھے۔

"خدا نے چاہا تو یہ کل لہروں پر سوار ہوگی" زوربن نے کہا تبھی ہی سمندر کی لہریں ایک جوش کے ساتھ ساحل پر چڑھ آئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ ہاں ہم بھی اس کشتی کو اپنے اوپر تیرتا ہوا دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔

"ہاں کل" زوربن کے برابر میں کھڑے ہوئے شخص نے زوربن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ریلا پاس ہی کھڑی کشتی کو غور و شوق کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی مگی پاس ہی بیٹھا کھیل رہا تھا۔ ریلا اسے بار بار سمندر کی جانب بڑھنے سے روک رہی تھی۔

"ہاں کل یہ کشتی سمندر میں داخل ہو جائے گی۔ اسے سمندر میں دھکیلنے کے لئے جزیرے کے

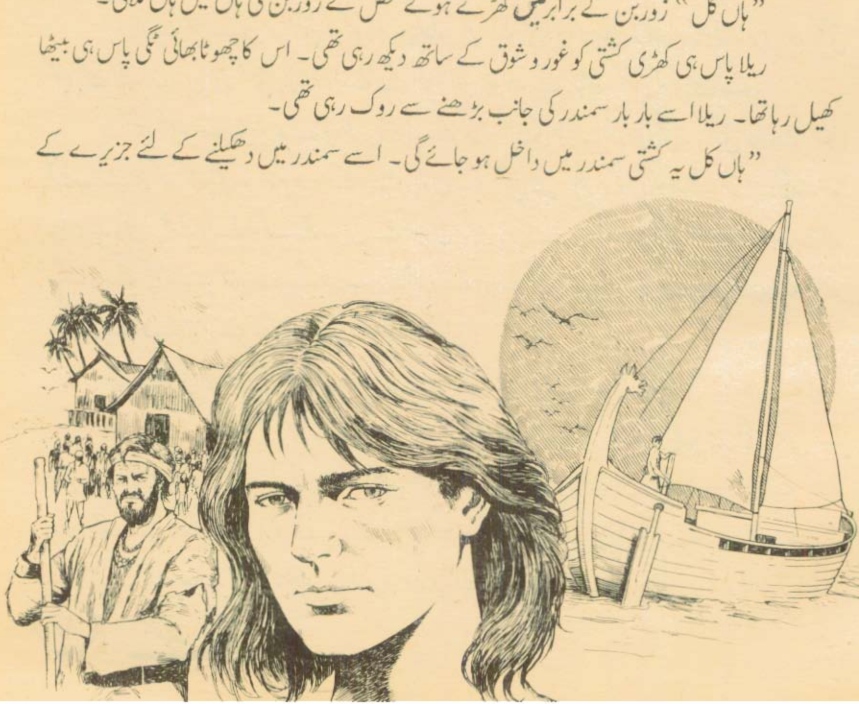

تمام لوگ ساحل پر جمع ہوں گے اور خوشیاں منائیں گے۔ حکیم صاحب آئیں گے اور کشتی اور اس کے بنانے والوں کو اپنی دعاؤں سے نوازیں گے۔ ہر طرف پھول ہوں گے اور گیت ہوں گے۔ ہم سب مل کر ہوا اور سمندر کی روح کی تعظیم میں گیت گائیں گے۔ اور آخر میں کشتی... مضبوط اور خوبصورت کشتی سمندر میں دھکیل دی جائے گی۔ زوربن کے برابر میں کھڑے آدمی نے مسرت بھرے لہجے میں مختصر سی تقریر کر ڈالی۔

"نگی ادھر آؤ" ریلا نے اپنے چھوٹے بھائی کو آواز دی اور پھر خود ہی آگے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور اسے اپنی جیب سے بہت ساری سیپیاں نکال کر دیں تاکہ وہ کچھ دیر... ان کے ساتھ کھیل سکے۔

تبھی ریلا کے کانوں میں عجیب سی آوازیں آئیں۔ "چنگ چنگ چنگ" یہ ایک انجن کی آواز تھی۔ ایک ایسی آواز جو جزیرے کے لوگوں کے لئے قطعاً نامانوس تھی۔ انجن کی آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی مدھم اور کبھی کبھی تیز سی موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ ایسی موسیقی تھی جس سے یہاں کے لوگ واقف نہیں تھے۔ یہ ذرا تیز اور سخت قسم کی موسیقی تھی۔

دور سمندر میں ایک سفید کشتی نظر آئی۔ وہ تیزی کے ساتھ جزیرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس پر نہ ملاّح تھے اور نہ ہی پتواریں۔

ریلا نے کھڑے ہو کر کشتی کو گھور کر دیکھا۔ نگی نے بھی اپنی سیپیاں زمین پر پھینک دیں اور کشتی کو دیکھنے لگا۔ زوربن اور کشتی بنانے والے دیگر افراد بھی حیرت کے ساتھ کشتی کو دیکھنے لگے۔

کشتی کسی سمندری پرندے کی طرح تیزی کے ساتھ ان کی طرف آرہی تھی۔ کشتی ان کے انتہائی قریب سے ہو کر گزر گئی۔ جزیرے کے رہنے والوں نے کشتی میں سوار لوگوں کو صاف طور پر دیکھا۔ یہ پیلاہٹ مائل رنگت والے لوگ تھے۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے ہیٹ تھے۔ اور جسم پر خوبصورت اور رنگ برنگے کپڑے۔ جزیرے کے قریب سے گذرتے ہوئے کشتی میں سوار لوگوں نے خوشی کے ساتھ ہاتھ ہلاتے ہوئے جزیرے کے لوگوں کی طرف دیکھا۔

"یہ امریکی اور یورپی افراد ہیں۔ یہ پلیشرر نام کے جزیرے سے آئے ہیں" زوربن نے کہا۔

"پلیشرر جزیرہ" ریلا نے یہ نام پہلے بھی سنا تھا۔ اس جزیرے کو ایک غیر ملکی شخص نے جزیرے کے امیر لوگوں کے لئے ایک پرفضا پکنک مقام میں تبدیل کر دیا تھا۔ امیر لوگ دور دراز سے آتے، یہاں پکنک مناتے۔ کچھ لوگ جزیرے پر بنے خوبصورت مکانوں میں کچھ دن قیام کرتے۔ یہ جزیرہ ریلا کے جزیرے سے صاف نظر آتا تھا۔ یہ جزیرہ سمندر کے درمیان ہی ایک بلند پہاڑی پر آباد تھا۔ ریلا نے

حسرت سے اس جزیرے کی طرف دیکھا۔ انجن والی کشتی ایک بار پھر ان کے پاس سے ہو کر گزری۔ اب وہ واپس جزیرے کی طرف جا رہی تھی۔

اس کشتی کو ایک شخص نے بڑے غور سے دیکھا۔ یہ منیا تھا۔ حکیم منیا زور بن کے جزیرے کا عالم فاضل آدمی۔ منیا نے انجن والی کشتی کو غور سے اور تشویش کے ساتھ دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کشتی پلیشر ر نام کے جزیرے سے آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کشتی پھر آئے گی۔

اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر امریکی اور یورپی سیاح اس کے جزیرے پر بھی ضرور آکر ٹھہریں گے۔ ایسا ہوا تو اس کے جزیرے کے لوگ نئی چیزیں دیکھیں گے۔ نئی چیزیں لیں گے اور نئی باتیں جانیں گے۔ اس طرح وہ نئی اور بری باتیں سیکھ جائیں گے۔ اور کیا خبر اس کے جزیرے کے لوگ کسی روز پلیشر ر جزیرے کی سیر کو بھی چلے جائیں گے۔ منیا نے اور نہ جانے کیا کیا سوچا۔

تبھی منیا کو زور بن کی نئی کشتی کا خیال آیا۔ "یہ ایک مضبوط کشتی ہوگی۔ اتنی مضبوط کے اس پر سوار ہو کر پلیشر ر نام کے جزیرہ پر بہ آسانی جایا جاسکے۔ منیا نے سوچا۔ منیا جزیرے کا حکیم ساحل کی طرف چل پڑا۔ کشتی بنانے والے لوگ کام چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ ریلا نے بھی حکیم کو آتے دیکھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو ایک بڑے سے پتھر کے پیچھا چھپا دیا کہ کہیں حکیم صاحب اسے وہاں دیکھ کر ناراض نہ ہو جائیں۔

"منیا" زور بن نے منیا کو دیکھ کر آگے بڑھتے ہوئے آواز لگائی۔ "منیا کشتی مکمل ہوگئی ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ کل سمندر میں ہوگی۔"

منیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"یہ کشتی کبھی بھی سمندر میں نہیں جائے گی۔ یہ شیطانی چرخہ ہے اسے فوراً توڑ کر پھینک دو۔"

سب خاموش تھے۔ ماحول پر اچانک ایک انجانا خوف طاری ہو گیا تھا۔ ابھی چند لمحے قبل وہاں خوشی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کشتی پر فخر کیا جا رہا تھا مگر اب وہاں صرف خوف چھایا ہوا تھا۔

بالآخر زور بن نے ہمت کی۔

"مگر منیا" زور بن نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم نے جب کشتی کے لئے درخت کاٹا تھا تو تب بھی آپ نے ہمارے لئے دعا کی تھی۔ بلکہ کشتی کی تیاری کے ہر مرحلے پر آپ نے ہماری کامیابی کے لئے دعائیں کی ہیں۔ مگر اب آپ کہہ رہے ہیں

کہ......"

زوربن کی اس یاد دہانی کے باوجود حکیم صاحب کا جواب وہی تھا۔ "یہ کشتی شیطانی چرخہ ہے۔ اسے توڑ دیا جانا چاہئے۔ یہ کشتی کبھی بھی سمندر میں نہیں جائے گی۔ " یہ کہتے کہتے حکیم صاحب کی آواز اتنی پر اسرار ہو گئی تھی جیسے وہ زمین و آسمان اور سمندر کی روحوں کو اپنی بات پر گواہ بنا رہے ہوں۔

"بہر حال میرا کہنا تو یہی ہے کہ اس کشتی کو توڑ دیا جائے۔" حکیم صاحب نے یہ کہا اور وہاں سے چلے گئے۔

سب خاموش اور ساکت کھڑے رہے۔ کشتی ساحل پر کھڑی تھی۔ وہ بہت خوبصورت اور مضبوط تھی۔ تبھی سمندر کی لہریں ساحل کے اوپر تک آئیں مگر کشتی کو چھوئے بغیر فوراً ہی واپس چلی گئیں جیسے وہ حکیم صاحب کی قوت سے ڈر گئی ہوں۔

"اب کیا ہوگا زوربن؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک آواز بلند ہوئی۔

"ہوگا کیا یہ کشتی کل ضرور سمندر میں جائے گی۔ آخر ہم نے مہینوں تک اسے بنانے کے لئے رات دن اس لئے تو محنت نہیں کی تھی کہ ہم اسے ایک دن میں توڑ کر پھینک دیں۔" زوربن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہاں موجود سب لوگوں نے خوف کے عالم میں زوربن کی طرف دیکھا۔

"تم اگر حکیم صاحب کی نافرمانی کرو گے تو تم پر عذاب نازل ہو سکتا ہے۔ جزیرے میں کوئی خطرناک بیماری پھیل سکتی ہے۔ زلزلہ آسکتا ہے۔" کسی نے زوربن کو سمجھایا۔

اس لمحہ ریلا کا بھائی ٹگی اٹھ کر گھر کی سمت چل پڑا۔ ریلا اس کے پیچھے چل پڑی۔ ان کے جاتے ہی وہاں زور دار بحث شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔

"منیا اب بوڑھا ہو چکا ہے" زوربن نے بحث کے دوران کئی بار یہ جملہ دہرایا۔

"وہ یہ بات بھول گیا ہے کہ انسان ہمیشہ آگے کی جانب ترقی کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایک کشتی خراب ہوتی ہے تو اس کی جگہ دوسری کشتی بنائی جائے گی۔ وہ ہمیں کشتی سمندر میں اتارنے سے منع تو کر سکتا ہے مگر روک نہیں سکتا۔" زوربن نے کہا۔

"وہ کشتی کو بد دعا دے دے گا" ایک آواز ابھری۔

"اور پھر یہ کشتی ہر گز نہیں تیر سکے گی۔ تمہیں یاد نہیں کہ اس نے پچھلے سال چاکو کے بارے میں کہا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ اور وہ مر گیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے" زوربن نے کہا۔ "مگر میں تمہیں بتاؤں وہ ایک برے کردار کا آدمی تھا۔ تم

سب نے سفید کشتی میں سوار لوگوں کو دیکھا ہو گا۔ ان کے ممالک میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہمیں جادو کا پٹارہ لگیں گی۔ مگر ان کے یہاں کوئی حکیم صاحب نہیں ہیں۔ دنیا کے دوسرے علاقوں میں اس طرح کے حکیموں کے دن کب کے گزر چکے۔ ہمارے جزیرے سے بھی ایسے آدمیوں کے دن گزرنے والے ہیں۔ کیونکہ حکیم کی قوت اس پر اثر کرتی ہے جو اس پر اعتبار کرتا ہو۔ میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ منیا ہماری کشتی کو اپنی بد دعا سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اور ہماری کشتی دور سمندر میں اترے گی۔ "

یہ بہادری والے الفاظ تھے۔ اور بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ زوربن ٹھیک ہی کہہ رہا ہے مگر وہاں موجود لوگوں میں سے صرف ایک شخص آگے بڑھا۔ یہ تکولائی تھا۔ ایک نڈر نوجوان۔

"میں تمہارا ساتھ دوں گا" تکولائی نے آگے بڑھ کر زوربن سے کہا۔ زوربن نے اس کی جانب تعریف بھری نظروں سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے کل ہم دونوں مل کر کشتی کو سمندر میں اتاریں گے" زوربن نے کہا۔

اگلی صبح کشتی کو سمندر میں اترتا دیکھنے کے لئے لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ ساحل پر جمع ہو گئی۔ ماضی کے برعکس اس بار کشتی عجیب انداز سے سمندر میں اترنے والی تھی۔ وہاں کسی ڈھول تاشے کا، کسی گیت گانے والے اور پھول برسانے والے کا نام و نشان نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو مارے خوف کے ساحل پر بھی نہیں آئے تھے۔ جو لوگ وہاں آئے تھے۔ انہیں ان کا تجسس وہاں کھینچ کر لے آیا تھا۔ اگرچہ ان سب کی ہمدردیاں زوربن کے ساتھ تھیں مگر ان میں سے کوئی یہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ ریلا بھی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ وہاں موجود تھی۔

تاہم وہ لوگ بھی جو وہاں موجود نہ تھے کشتی کے بارے میں جاننے کے لئے اتنے ہی بے چین تھے جتنے وہاں موجود لوگ۔ سب لوگ جانتے تھے کہ آج حکیم صاحب کی انجانی قوت کا امتحان ہے۔ اس لئے وہ سب خوف زدہ تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ زوربن اور تکولائی کے بارے میں خوف کا شکار تھے بلکہ اپنے بارے میں بھی۔

مگر زوربن ذرا بھی ڈرا ہوا نہیں تھا۔ "کشتی ضرور سمندر میں اترے گی۔" اس کا عزم تھا۔

زوربن اور تکولائی دونوں نے مل کر کشتی کو سمندر میں اتارا۔ پھر وہ اس میں بیٹھ گئے۔ اگرچہ یہ کشتی اتنی بڑی تھی کہ اسے چلانے کے لئے کئی افراد کی ضرورت تھی۔ مگر وہ دونوں اتنے مضبوط تو تھے کہ اس کشتی کو چلا سکیں۔ پھر انہوں نے کچھ دعا سی کی اور چپو چلانے شروع کر دیئے۔

ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ خوف اور بدحواسی کے عالم میں جاتی ہوئی کشتی کو دیکھ رہے تھے۔ ریلا

بہت خوش تھی۔ اچانک اس نے اپنی جیب سے ایک پھول نکال کر کشتی کی سمت میں اچھالا۔ لوگوں نے حیرت سے ریلا کو دیکھا مگر اس کے بعد ان کے چہروں کی سختی کچھ کم ہو گئی۔

چند لمحوں بعد منیا حکیم آپہنچا۔ ایک انتقام لینے والے آدمی کے انداز میں وہ تیزی کے ساتھ ساحل کی جانب بڑھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور غیظ و غضب سے بھری ہوئی آواز میں بولا۔

"اس کشتی کو لہروں کی سواری کبھی نصیب نہ ہوگی۔" ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ بالکل ایسی جیسے موت والے گھر میں چھا جاتی ہے۔ ہر نظر حکیم صاحب پر تھی۔ اور ہر نظر کشتی پر بھی تھی۔

زوربن ٹھیک کہتا تھا۔ منیا حکیم کے پاس ایسی کوئی پراسرار قوت نہ تھی جو لوگوں کو نقصان پہنچا سکے۔ کشتی آگے بڑھ رہی تھی۔ مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔

ساحل پر کھڑے لوگ اسے گھور رہے تھے۔ گھور رہے تھے۔

اچانک ایک عجیب سی آواز آئی۔ لگا کشتی ڈوب رہی ہے۔ واقعی کشتی دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں کشتی سمندر میں غرق ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے سمندر کے اندر کھینچ لیا ہے۔

کشتی کے ڈوبتے ہی ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ خوف کے مارے اپنی اپنی چھونپڑیوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ساحل بالکل خالی ہو گیا۔

زوربن اور تکولائی نے تیر کر اپنی جانیں بچائیں۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہاں البتہ ایک پھول سمندر کے کنارے پر تیر رہا تھا۔

دن گزر گیا اور پھر رات بھی۔ اگلی صبح لوگوں نے دیکھا کہ ڈوبی ہوئی کشتی سمندر کے کنارے پڑی ہوئی ہے۔ کیا یہ حکیم صاحب کی کرامت تھی۔ یا زوربن اور تکولائی کسی طرح اسے کھینچ کر لائے تھے؟ یا سمندر کی لہریں اسے ساحل تک لے کر آئیں تھیں؟ سب ذہنوں میں یہ سوال موجود تھے مگر کسی نے کسی سے نہ پوچھے۔ بہرحال خوبصورت اور مضبوط کشتی ساحل پر پڑی تھی۔ اب یہ کشتی حکیم صاحب کی انجانی قوت کی ایک نشانی بن چکی تھی۔ کشتی کئی روز تک ساحل پر پڑی رہی مگر کسی نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا۔ یہاں تک کہ سمندر کی لہریں بھی اس کو نہیں چھو رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھی لوگوں کی طرح حکیم صاحب کی قوت سے خوف زدہ ہو گئی تھیں۔

ایک روز ریلا کا چھوٹا بھائی کھیلتا ہوا ادھر جا نکلا۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہ اس کشتی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ کشتی کو ادھر ادھر سے چھو کر دیکھنے لگا۔

ریلا کو چند لمحوں بعد احساس ہوا کہ اس کا چھوٹا بھائی غائب ہے تو وہ اسے تلاش کرنے کے لئے گھر سے نکلی۔ تبھی ایک چیخ فضا میں گونجی۔ ہر شخص نے کشی کی جانب دیکھا۔ چیخ اسی کے پاس سے آئی تھی۔

یہ کیا ہو سکتا ہے؟

یقیناً کشتی ایک شیطانی چرخہ ہی تھی۔

تاہم ریلا فوراً جان گئی کہ یہ اس کے بھائی کی چیخ ہے۔

"یہ میرے چھوٹے بھائی کی چیخ ہے۔ وہ یقیناً کشتی میں پھنس گیا ہے۔"

تبھی ایک عورت جھونپڑی سے نکلی اور زور زور سے چیخنے لگی۔

"ارے سنو! ارے یہ چیخ سنو! دیکھو بچہ کسی شیطانی قوت کے قبضے میں ہے۔ بے وقوف بچہ...... وہاں گیا ہی کیوں تھا۔"

ریلا اگرچہ شیطانی قوت سے بہت خوف زدہ تھی مگر اسے اپنے چھوٹے بھائی سے محبت بھی بہت تھی۔ چنانچہ ایک لمحے جھجکنے کے بعد وہ کشتی کی طرف دوڑ پڑی۔ لوگوں کے منہ خوف کے مارے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پھر وہ بھی ریلا سے تھوڑا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے کشتی کی طرف دوڑے۔

کشتی کے تھوڑا قریب جاکر انہوں نے دیکھا کہ نگی کشتی کے پیندے کے پاس بیٹھا ہوا ہے اور اس کا ایک ہاتھ کشتی کے پیندے سے چپکا ہوا ہے۔ ایسے جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے پکڑ رکھا ہو۔ نگی ہاتھ کو چھڑانے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ حکیم صاحب کی قوت بڑی ہی بھیانک تھی۔ اس نے ایک بچہ کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔

زوربن اس دن ساحل پر نہیں تھا۔ مگر اس نے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا کشتی کے پاس پہنچا۔ اس وقت ریلا اپنے بھائی کے ہاتھ کو کشتی سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اس کی انگلی کشتی میں موجود ایک سوراخ میں پھنسی ہوئی ہے اور نکل نہیں رہی" ریلا نے زوربن کو بتایا۔

کوئی بھاگ کر تھوڑا سا تیل لے آئے۔" زوربن نے تھوڑے فاصلے پر موجود لوگوں کی طرف دیکھ

کر کہا۔

چند لمحوں بعد کھوپرے کے تیل سے بھرا ہوا ایک ڈبا ان تک پہنچا دیا گیا۔ زوربن نے دھیرے دھیرے بچے کی انگلی پر تیل لگایا۔ انگلی ٹگی کی مسلسل کوشش کے باعث سوج گئی تھی۔ بچہ اپنی بہن کے گرم ہاتھوں میں آکر تکلیف کے باوجود سو گیا تھا۔ لوگ اور قریب آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ٹگی کی انگلی کسی شیطانی قوت نے نہیں پکڑ رکھی تھی بلکہ وہ ایک سوراخ میں پھنسی تھی۔ یہ دیکھ کر لوگوں کا خوف دور ہوا۔ اور اب کچھ لوگ انگلی کو نکالنے کی ترکیبیں بتا رہے تھے۔ بالآخر ٹگی کی انگلی سوراخ سے نکل آئی۔

"اسے اب گھر لے جاؤ۔" زوربن نے ریلا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم ایک بہادر بچی ہو۔ اگلی بار جب کشتی سمندر میں اترے گی تو تم اس کا افتتاح کرو گی" زوربن نے ریلا کو شاباشی دیتے ہوئے کہا۔ ریلا زوربن کی اس شاباشی سے خوش ہو گئی اور اپنے چھوٹے بھائی کو کاندھے سے لگا کر گھر کی طرف دوڑ پڑی۔

ریلا کے جاتے ہی زوربن نے لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "جب یہ کشتی سمندر میں اتاری گئی تھی تو تم سب نے اسے ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ سب لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ منیا حکیم کی بد دعا کے نتیجے میں ہوا تھا۔ مگر اب آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہ کشتی سوراخ کے باعث ڈوبی تھی۔"

یہ کہہ کر زوربن نے کشتی کے اس حصہ کو تھوڑا سا اٹھا کر لوگوں کو وہ سوراخ دکھایا جس میں ٹگی کی انگلی پھنس گئی تھی۔ لوگوں نے حیرت کے ساتھ سوراخ کو دیکھا اور پھر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔

"ہم نے یہ کشتی بنائی تھی اور ہم جانتے ہیں کہ اس میں کوئی معمولی سا سوراخ بھی موجود نہیں تھا۔ یہ سوراخ کشتی کی روانگی والی رات کو بنایا گیا ہے۔" زوربن نے کہا۔ اور یوں اس نے اپنی آواز کو مدہم کرتے ہوئے کہا۔

"اور آپ کو معلوم ہے یہ سوراخ کس نے کیا تھا۔ یہ سوراخ حکیم منیا نے کیا تھا۔"

لوگوں کے چہروں پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات پھیل گئے۔ لیکن اس سے قبل کے کوئی کچھ کہتا لوگوں کی پشت سے ایک آواز بلند ہوئی۔

"زوربن ٹھیک کہتا ہے" یہ حکیم صاحب کی آواز تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا کشتی کے پاس جا کھڑا ہوا اور پھر یوں گویا ہوا

"میں نے یہ سوراخ تم لوگوں کو بچانے کے لئے کیا تھا۔ ترقی کے نقصان دہ اثرات سے بچانے

کے لئے۔ یقین کیجئے یہ سب کچھ میں نے آپ کے بھلے کے لئے کیا تھا۔"

وہ بہت دیر تک تقریر کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کے غیر ملکی سیاح یہاں آئیں یا یہاں کے لوگ سیاحوں کے پاس جائیں۔ کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ سیّاحوں کی زندگی کے برے اثرات جزیرے کے لوگوں کو خراب کر دیں گے۔

"مگر شاید میں غلطی پر تھا۔ کم از کم کشتی کو نقصان پہچانا تو سراسر غلطی تھی۔ مگر اب آپ یہ تو جان ہی چکے ہوں گے کہ کشتی میں یہ سوراخ میں نے کسی انجانی قوت کے ذریعہ نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں کے زریعہ بنایا ہے۔ آیئے ہم ایک اور کشتی بنائیں۔ اس سے بڑی۔ مضبوط اور خوبصورت کشتی۔ کیوں زوربن کیا تم ایک اور کشتی نہیں بناؤ گے"؟ منیا نے پوچھا۔

"کیوں نہیں" زوربن نے جواب دیا۔

کئی ہفتوں کی محنت کے بعد ایک اور کشتی تیار ہو گئی۔ اور پھر اس کے سمندر میں اترنے کا دن آپہنچا۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ ہر طرف پھول اور گیت تھے۔ تبھی چنگ چنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ غیر ملکیوں کی سفید کشتی ایک بار پھر ان کی جانب آ رہی تھی۔

"امریکہ اور یورپی لوگ ہم سے ملنے آ رہے ہیں، شاید ان کے ملک میں ایسی تقریب نہیں ہوتی ہو گی۔" کسی نے کہا۔

منیا غیر ملکیوں کے قریب آنے کا انتظار کر تا رہا۔ پھر جیسے ہی وہ قریب آئے اس نے ایک اشارہ کیا۔

منیا کا اشارہ پاتے ہی زوربن تکولائی اور چند چنے ہوئے لوگ کشتی میں سوار ہو گئے۔ لوگوں نے اُن کے گلوں کو پھولوں کے ہاروں سے بھر دیا۔ اچانک کسی نے ریلا کو پکڑ کر اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں کشتی کا افتتاح کرنے والا کھڑا ہوا کر تا تھا۔ ریلا پر ہر طرف سے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ ریلا شرم اور فخر سے لال ہو گئی۔

حکیم منیا ساحل پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور دعا کی کہ کشتی پر خدا کی رحمت ہو۔

پھر چپّو چلے اور کشتی آگے بڑھنے لگی۔ ہر طرف گیت گونجنے لگے۔ کشتی لہروں کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بالکل ان گیتوں کی طرح جو اسے بناتے ہوئے گائے گئے تھے۔

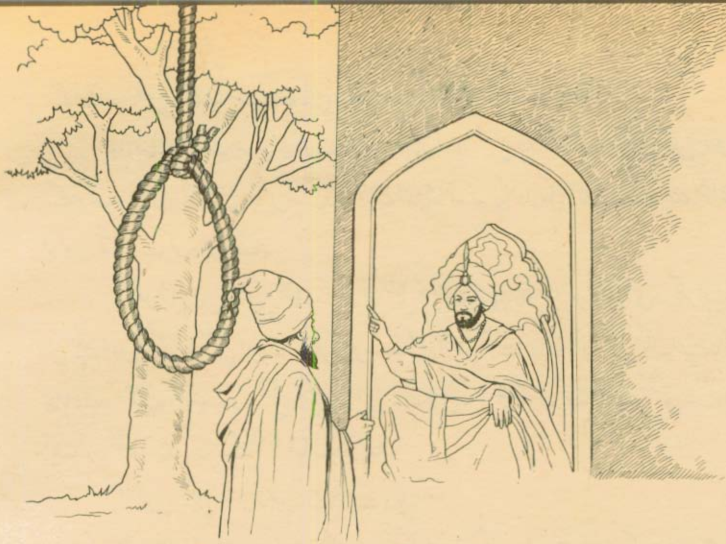

پھانسی کا درخت

عنبر چغتائی

اک مسخرے سے ہوگیا ناراض بادشاہ
پھانسی کی دی سزا تو وہ بولا جہاں پناہ!
منصب ملے، خطاب ملے، اب سزا ملے،
یہ بات فخر کی ہے مری نسل کے لئے!
کیا ہے مری مجال ذرا لب ہلاؤں میں،
لیکن یہ حکم "آخری خواہش! بتاؤں میں
بس اتنا چاہتا ہوں، اجازت مجھے ملے
موزوں درخت ڈھونڈلوں پھانسی کے واسطے!"
یہ بات سارے ملک میں مشہور ہوگئی
درخواست انتخاب کی منظور ہوگئی!
بائیس سال پھرتا رہا وہ اِدھر اُدھر
ڈھونڈا کیا درخت حکومت کے خرچ پر
اک دن اسی تلاش میں بے چارہ مر گیا!
"موزوں درخت" گو نہ ملا، نام کر گیا!!

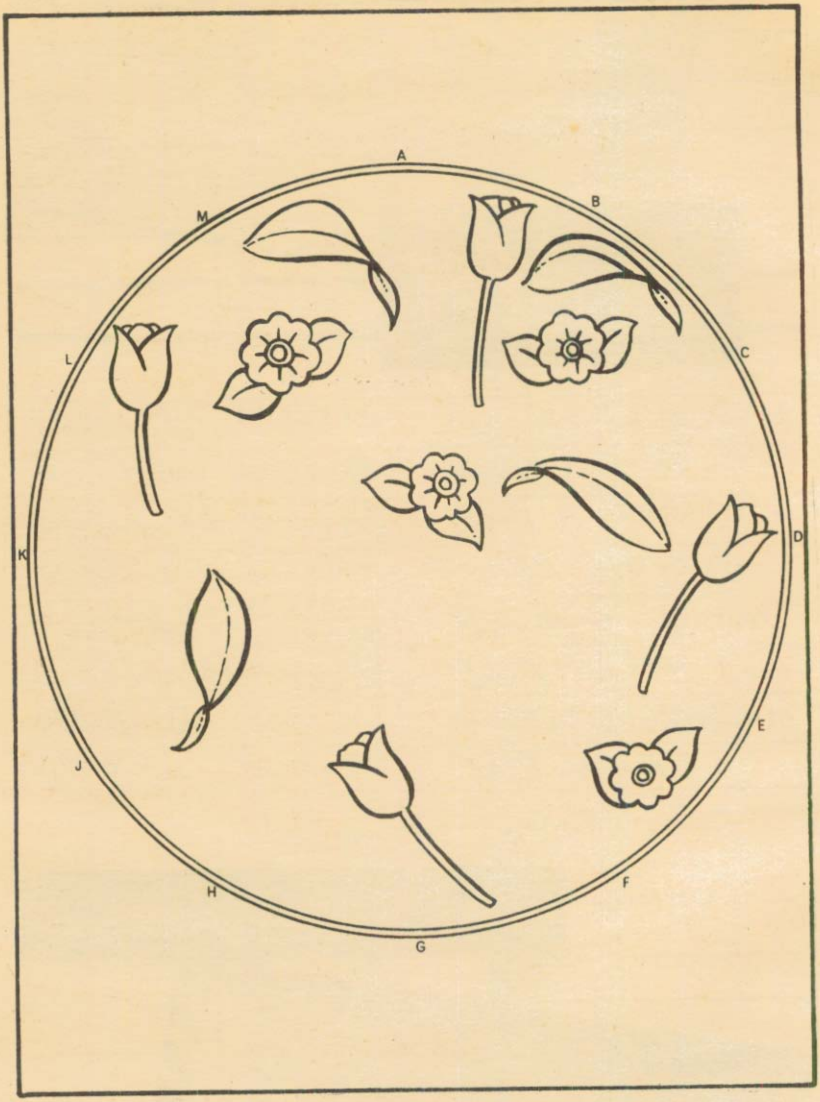

اس دائرے کو چار حصّوں میں اس طرح تقسیم کریں کہ ہر حصّے میں دونوں پھول اور پتّا موجود رہے۔

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمّد حسین برادرز۔ کراچی فون: ۵۵۹۳۲ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون: ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون: ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون: ۲۹۵۷
ملک تاج محمّد صاحب۔ راولپنڈی فون: ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون: ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون: ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیمیار خان فون: ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون: ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون: ۲۴۱۴
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون: ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بُک ڈپو۔ فیصل آباد فون: ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بُک اسٹال۔ گجرات فون: ۰۴۳۳۱	مسلم بُک ڈپو۔ سرائے عالمگیر

یونائیٹڈ بک لینڈ سکھّر فون: ۸۵۷۲۸

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۹

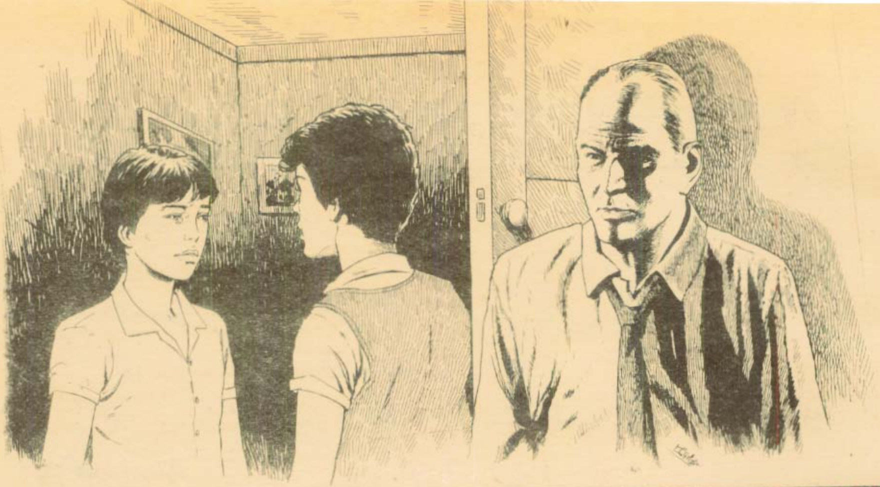

ندامت کے آنسو

نعمان راشد صدیقی

سیٹھ کمال احمد ایک بارعب افسر تھے۔ بہت قابل اور محنتی، مگر ان میں ایک بات یہ تھی کہ ہر ملنے والا ان سے خوفزدہ رہتا۔ دفتر کا ماحول تو ایسا ہوتا کہ کسی کو جگہ سے ہلنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ہر ماتحت ان سے دور دور رہتا۔ اور ان پر سیٹھ کمال کی اتنی دہشت تھی کہ آپس میں بھی ان کے خلاف بات نہ کرتے۔

دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ دفتر کا وقت آٹھ بجے کا تھا۔ مگر ساڑھے گیارہ بجے لان میں ایک لمبی مرسڈیز داخل ہوئی۔ اس کی پچھلی نشست پر سیٹھ کمال تشریف فرما تھے۔ ڈرائیور نے اتر کر مستعدی سے دروازہ کھولا۔ سیٹھ کمال نے باوقار انداز میں قدم باہر نکالے۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا۔ اور ان کا بریف کیس اٹھا کر ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دفتر میں داخل ہو گیا۔ سیٹھ کمال کے داخل ہوتے ہی تمام ماتحت اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئے تو وہ بیٹھ گئے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کمرے کے اندر سے ہی آواز بلند ہوئی۔

"بشیر فوراً میرے کمرے میں آؤ۔"

بشیراس دفتر کا ٹائپسٹ تھا۔ اس آواز کے ساتھ ہی اس کا رنگ اڑ گیا لرزتے قدموں سے وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ دل میں دعائیں کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ سیٹھ کمال کے چہرے پر شدید غم و غصہ کے آثار نمایاں تھے۔

"جی سر" ......، بشیر نے کہا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے یہاں تمہیں؟" ......، سیٹھ کمال نے گرج کر کہا۔

"جی...... ایک سال" ......، بشیر نے جواب دیا۔

کیا اس ایک سال میں تم نے یہ کام سیکھا ہے؟" ......، سیٹھ کمال نے اس کے ہاتھوں کا ٹائپ شدہ ایک کاغذ لہرا کر کہا۔

"جی...... کیا غلطی ہو گئی" ......؟ بشیر نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"غلطی نہ کہو، گناہ کہو، میرے نزدیک یہ گناہ ہے۔ کیونکہ یہی تمہارا کام ہے۔ تم اسی کام کی تنخواہ لیتے ہو۔ پھر بھی غلطی کرتے ہو۔" سیٹھ کمال نے نہایت زور دار آواز میں کہا۔ جواب میں بشیر کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

"یہ لے جاؤ اور خود نوٹ کرو کہ کیا غلطی ہے اس میں اور اسے ٹھیک کرو۔ اور اگر نہ ہو سکے تو اپنا استعفیٰ ضرور ٹائپ کر کے لے آنا... جاؤ اب دفع ہو جاؤ۔" سیٹھ کمال نے کاغذ اچھال کر کہا اور بشیر اسے لے کر باہر نکل گیا۔

...... ○ ...... ○ ......

سیٹھ کمال گھر میں داخل ہوئے۔ اندر آتے ہی انہوں نے کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"کاشف کہاں ہے؟" کمرے میں بیٹھی اپنی بیگم سے بھی انہوں نے غصے سے پوچھا۔

"جانسن کے گھر گیا ہے۔" ان کی بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جانسن، کیا مطلب؟ ...... ہمارا بیٹا ایک عیسائی کے گھر گیا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔" سیٹھ کمال نے گونج دار آواز میں کہا۔

"وہ اس کا دوست ہے۔" بیگم نے تحمل سے جواب دیا۔

"کوئی عیسائی ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔ بیگم، تم نے اسے منع نہیں کیا؟"

سیٹھ کمال نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"ہم سبؑ برابر ہیں۔ اسلام نے ہمیں مساوات کا درس دیا ہے۔ اگر ہم عیسائیوں سے دوستی کریں گے تو کیا ہو جائے گا؟" بیگم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اسے لے کر آتا ہوں پھر تم دونوں کو اکٹھا ہی سمجھاؤں گا کہ کیا ہو جاتا ہے۔" یہ کہہ کر سیٹھ کمال نے زور دار انداز سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔

جانسن کا گھر انہوں نے دیکھ رکھا تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ یہاں کاشف کو لینے آ چکے تھے۔ جانسن کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اور وہ ایک غریب شخص کے ساتھ رہتا تھا۔ جلد ہی وہ اسکے گھر پہنچ گئے۔ گھر کیا تھا، سر چھپانے کا ایک ٹھکانہ تھا۔ اس ٹوٹے پھوٹے مکان کے باہر ہی اسے وہ شخص مل گیا۔ جس کے ساتھ جانسن رہتا تھا۔

"سلام صاحب۔" اس نے سیٹھ کمال کو دیکھتے ہی کہا۔

"کاشف اندر ہے؟" انہوں نے سلام کا جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھا۔

"جی صاحب اندر ہی ہے۔" اس نے کہا۔ اور سیٹھ کمال اندر داخل ہوگئے۔ اندر سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس کمرے تک پہنچ گئے جس میں دونوں بیٹھے تھے۔ دروازے سے کان لگا کر انہوں نے سنا۔ جانسن کہہ رہا تھا۔

"جی ہاں میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ جو مقام ہم حضرت عیسیٰؑ کو دیتے ہیں وہ ہم غلط کرتے ہیں اور حضورؐ ہی ہمارے آخری نبی ہیں۔"

"بہت اچھے۔" کاشف کی آواز آئی۔

"اور یہ بھی کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن ضرور نیچے آئیں گے مگر نبوت کا دعویٰ نہیں کریں گے بلکہ ایک امتی کی حیثیت سے آئیں گے۔" جانسن نے کہا۔

"اچھا ہے کہ تمہیں ان باتوں کی حقیقت پتہ چل گئی اب میں تمہیں آج کا سبق دیتا ہوں اور وہ ہے "حسن اخلاق۔"

"جی بالکل بتایئے۔" جانسن کی آواز آئی۔

"سب سے اعلیٰ اور اچھی بات جو ایک انسان میں ہو سکتی ہے وہ ہے اچھا اخلاق۔" کاشف کی آواز آئی۔

"مگر آپ نے پہلے تو کہا تھا کہ قیامت کے دن پہلا سوال نماز کے متعلق ہوگا اور وہی اعلیٰ ترین عبادت ہے۔" جانسن نے کہا۔

"وہ بات اپنی جگہ صحیح ہے اور بلاشبہ نماز اور روزہ کو اور سب چیزوں میں فضیلت حاصل ہے۔ لیکن حضرت محمدؐ کی ایک حدیث یہ بھی ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ "انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔"

"اچھا!" جانسن نے کہا۔ "تو کیا حسن اخلاق اتنی بڑی چیز ہے؟"......، اس نے سوال پوچھا۔

"ہاں ہاں، ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

"سمجھ گیا"......، جانسن نے کہا...... "مگر یہ تو بہت آسان سی بات ہے خوش اخلاقی اختیار کرنا مشکل تو نہیں ہے نا؟"

"مشکل نہیں ہے، یہ ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے مگر وہ اس کو استعمال نہیں کرتا۔" کاشف بولا۔

"وہ کیسے؟" جانسن نے پوچھا۔

"یہ بھی میں تمہیں حضورؐ کے فرمان کی روشنی میں بتاؤں گا۔ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوتیں ہیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔"

جانسن نے اثبات میں سرہلا دیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کاشف نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور چونک اٹھا پھر بولا۔

"اچھا جانسن مجھے بہت دیر ہوچکی ہے میں چلتا ہوں۔ امید ہے کہ تم حضورؐ کے اقوال سے اپنے اندر بہترین حسن اخلاق پیدا کروگے۔ اور ہاں ایک اور حدیث سن لو اس کے بعد تمہیں حسن اخلاق کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ حدیث ہے کہ

"تم میں سب سے پیارے اور قیامت کے دن نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہوں گے جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہونگے جو تم میں بد اخلاق ہیں۔"

دروازے پر کھڑے سیٹھ کمال کے چہرے پر عجیب عالم طاری تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ندامت کے آنسو۔

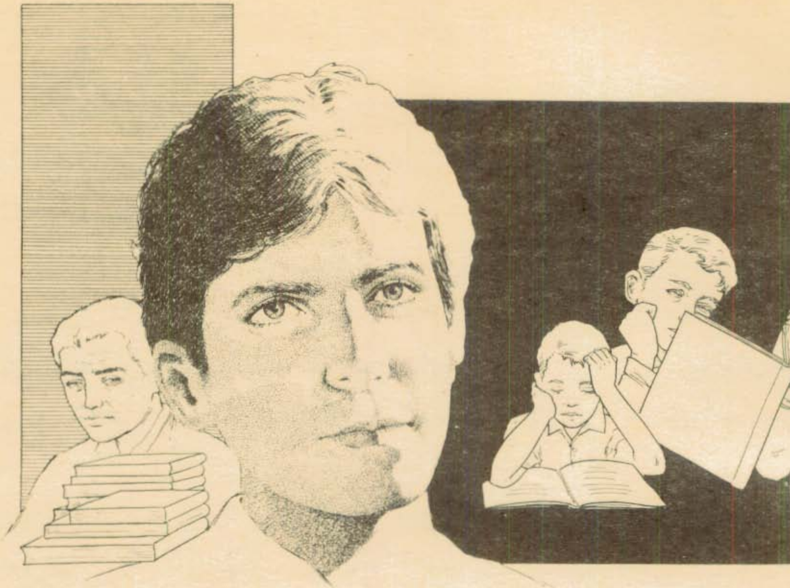

منزل دے کہاں میری

محمد عادل منہاج

میں اپنی آپ بیتی اس وقت سے شروع کرتا ہوں جب میں پہلی جماعت میں داخل ہوا۔ میں ان بچوں میں سے نہیں تھا جو ابتداً روتے ہوئے اسکول جاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں پہلی بار بہت خوشی خوشی اسکول گیا تھا۔ اسکول کی دنیا میرے لئے ایک نئی اور دلچسپ دنیا تھی اور میں اس دنیا میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اگرچہ بچپن کے سب واقعات تو مجھے یاد نہیں رہے لیکن اتنا مجھے یاد ہے کہ پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا اور میں نصاب کی کتابوں کے علاوہ فارغ اوقات میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھتا۔

پڑھنے کا شوق مجھے جنون کی حد تک تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں بچوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہوں جنہیں 'کتابی کیڑا' کہا جاتا ہے۔

مجھے بچپن سے ہی ذہین سمجھا جاتا تھا کیونکہ میں ہر کلاس میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور لیتا تھا۔ اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کہ میں کس طرح پڑھ رہا ہوں۔ جس جس طریقے سے استاد ہمیں پڑھا رہے تھے ہم پڑھ رہے تھے۔

جس طرح ہمارے ملک میں ہر بچے کے متعلق والدین یہ طے کرتے ہیں کہ اسے بڑے ہو کر کیا بننا ہے۔ اسی طرح میرے والدین نے مجھے ڈاکٹر بنانے کا عزم کر لیا اور میں بھی یہ جانے بغیر کہ ڈاکٹر بننے کی مجھ میں صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ ہر ایک سے یہ کہنے لگا کہ میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔ یہاں تک کہ میں نے پانچویں جماعت پاس کر لی۔ چھٹی کلاس میں میرا داخلہ دوسرے اسکول میں ہوا یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا تعلق کسی بہت امیر گھرانے سے نہیں تھا چھٹی جماعت میں میرا داخلہ ایک عام سے سرکاری اسکول میں ہوا۔ جہاں میں ہر کلاس میں پوزیشن لیتا رہا۔ اس وقت میں بھی اپنی ذہانت اور کامیابیوں پر بہت خوش اور مطمئن تھا۔ آج اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو ایک آہ بھرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی برباد کی۔ لیکن اس میں میرا قصور تو نہ تھا۔ مجھے استادوں نے جس طرح پڑھایا میں نے پڑھا اور اسی کو پڑھائی کی معراج جانا۔ ہمیں پڑھانے کا طریقہ کچھ یوں تھا کہ کسی بھی مضمون کے استاد آتے، کتاب کھولتے اور اس کی ریڈنگ کرتے یعنی کتاب میں لکھا ہوا مضمون پڑھ کر سناتے پھر مختلف لڑکوں سے پڑھواتے، اس کے بعد مضمون کے آخر میں لکھے گئے سوالات کے جوابات کتاب میں سے بتا دیتے کہ کتاب کے فلاں فلاں پیرے ہیں اس کا جواب ہے۔ ہم کتاب کے وہ پیراگراف مِن و عَن کاپی پر نقل کرتے اور اسے یاد کرنا، دوسرے لفظوں میں رٹّا لگانا شروع کر دیتے۔ رٹّا اس لئے کہ یاد وہ چیز کی جاتی ہے جو سمجھ میں آتی ہو۔ مگر ہمیں خواہ کچھ سمجھ میں آتا یا نہ آتا وہ سب کچھ یاد ہوتا۔ امتحان سے پہلے ہمیں سوالات (امپورٹنٹ) لکھوا دیئے جاتے (اگر انہی استادوں سے ٹیوشن پڑھتے تو مزید اہم سوالات پتا چلتے) وہ اہم سوالات ہم یاد کرتے یعنی رٹتے پھر پرچے میں جوں کے توں لکھ آتے اور ہمیں ستّر اسّی فیصد نمبر مل جاتے۔

مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ نہ تو سوال ہی میری سمجھ میں آتا نہ جواب۔ اس کے باوجود میں ہر سوال کا جواب صحیح لکھ کر آتا۔ اسے یوں سمجھ لیں کہ اگر وہی سوال ذرا دوسرے انداز میں بدل کر پوچھا جاتا تو میں یقیناً جواب نہ دے پاتا۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ سوال "جس طرح" ہم یاد کرتے، "اسی طرح" امتحان میں

پوچھا جاتا۔ یہ اللہ کا کرم تھا کہ میرا حافظہ یارٹنے کی صلاحیت کچھ بہتر تھی اور پھر میں چونکہ ہر وقت پڑھتا رہتا لہٰذا امتحان میں لفظ بہ لفظ لکھ آتا اور پوزیشن میری ہوتی۔ جو بچے کم رٹتے ان کے نمبر کم آتے گویا امتحانوں کا اصول یہ تھا 'زیادہ رٹو، زیادہ نمبر حاصل کرو۔'

اسی اسکول میں ایک دو اچھے استاد بھی تھے جو پڑھانے کی بجائے سمجھاتے مگر چونکہ ان کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم تھی۔ لہٰذا وہ کچھ نہ کر پاتے اور ہمیں کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا۔

یوں میرا پڑھائی کا یہ سفر جاری رہا۔ میرا بنیادی مقصد 'علم حاصل کرنا' نہیں بلکہ 'امتحان پاس کرنا' تھا۔ اور ہمارے نظام تعلیم میں امتحان پاس کرنا، علم حاصل کرنے سے بالکل مختلف ہے۔ امتحان ذہانت کا نہیں محض حافظے کا امتحان ہے۔ میں بھی کتابوں کی کتابیں رٹتا، امتحان دیتا اور پھر سب کچھ بھول جاتا۔ اگلی کلاس میں پہنچ کر نئے امتحان کی تیاری کرتا۔ یہ سفر بھی بخیر و خوبی کٹ گیا اور میں نے دسویں پاس کرلی۔ میرے نمبر اگرچہ بہت اچھے نہ آئے تو بہت خراب بھی نہ تھے۔ مجھے بہر حال ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ میں نے ظاہر ہے "پری میڈیکل" میں داخلہ لیا کیونکہ مجھے ڈاکٹر بننا تھا میں نے اس کے علاوہ کبھی کچھ اور سوچا ہی نہ تھا۔ بچپن سے اب تک یہ بات ہزاروں مرتبہ میرے ذہن میں ڈالی گئی تھی اور اتنی پختہ کر دی گئی تھی کہ میں نے کبھی خود کچھ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ میں بس ایک بنے بنائے راستے پر اندھا دھند چلتا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس طرح امتحان پاس کر کے میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ اس وقت مجھے منزل آنکھوں کے سامنے نظر آتی تھی اور آج کوسوں دور اتنی دور جہاں تک میں کبھی بھی نہ پہنچ سکوں گا۔

کالج میں آکر مجھے جس پہلی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تھی "انگریزی"۔ یہیں سے میرے راستے میں رکاوٹوں کا آغاز ہوا۔ میں نے دسویں تک اردو میڈیم میں پڑھا تھا اور پڑھا کیا تھا رٹا تھا۔ اگر پڑھا ہوتا تو انگریزی کچھ بہتر ہوتی۔ اس کالج میں اچھے اچھے انگلش میڈیم کے پڑھے ہوئے لڑکے آئے تھے۔ میرے جیسے چند ایک تھے۔ لہٰذا ہم سب کا ایک گروپ بن گیا جو ہمیشہ کلاس میں پیچھے بیٹھتا۔ اسکول کا ذہین ترین بچہ اب کالج کی آخری بنچوں پر بیٹھتا کیونکہ اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔

کالج کے کچھ ٹیچر ایسے تھے جو کہ لیکچر انگریزی میں دیتے اور کچھ ایسے تھے جو "انگریزی مکس اردو" میں لیکچر دیتے۔ انگریزی مکس اردو والوں سے تو کام بن جاتا مگر مکمل انگریزی والا لیکچر سر پر سے گذر جاتا۔ یوں بھی مجھے تو کتاب پڑھ کر رٹنے کی عادت تھی۔ لیکچر سن کر سمجھنا میرے بس سے باہر تھا۔ بہر حال میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اور تھوڑا بہت سمجھنے لگا تھا۔ اگر ہمارے یہاں دسویں کے بعد بھی علم کا نزول'

انگریزی کے بجائے اردو میں ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ اس طرح مجھ میں لیکچر سن کر سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی مگر اس دوہرے نظام نے مجھے تباہ کر دیا۔ اب یہ ہوتا کہ محض ایک دو ٹیچروں کی بات سمجھ میں آتی، باقی کلاسوں میں مَیں ہونقوں کی طرح بیٹھا رہتا۔ اگر کبھی ٹیچر انگلش میں مجھ سے پوچھ لیتے کہ ''سمجھ رہے ہو نا؟'' تو میں گھبرا جاتا اور مجھے سے اتنا نہ ہوتا کہ انگلش میں ایک چھوٹا سا جملہ بول دوں۔ میں ندامت اور گھبراہٹ سے ٹیچر کی طرف دیکھتا مگر وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر آگے لیکچر دیے رہے ہوتے۔

کالج میں آکر ایک اور لفظ جس سے میں مانوس ہوا، وہ تھا ''نوٹس''۔ طالب علم نوٹس کے لئے مارے مارے پھرتے۔ کوئی ٹیچروں کے پیچھے تو کوئی کوچنگ سینٹروں میں۔ آج یہ احساس ہوتا ہے کہ طریقہ تو یہ ہونا چاہئے کہ ہم لیکچر سنیں پھر کتاب پڑھیں اور خود نوٹس تیار کریں۔ مگر ہم سب پکی پکائی کھانے کے عادی تھے۔ مجھے تو خیر لیکچر ہی پورے طور سمجھ نہ آتا تھا نوٹس کیا بناتا مگر ہوشیار لڑکے بھی نوٹس بنانے سے گریز کرتے۔ یہاں ایک بار پھر معذرت کے ساتھ اساتذہ کی شکایت کروں گا کہ وہ بھی طالب علموں کے خود نوٹس تیار کرنے کی حوصلہ افزائی نہ کرتے بلکہ بہت سے ٹیچر تو خود کلاسوں میں نوٹس لکھوا دیتے اور کچھ بنے بنائے نوٹس لا دیتے پھر لڑکے ان کی فوٹو اسٹیٹ کروا کروا کر گھر لے جاتے۔ بہرحال یوں میرا کام بھی بن گیا۔ مجھے بھی بنے بنائے نوٹس مل گئے اور میرا رٹنا پھر شروع ہو گیا۔

ان حالات کی وجہ سے کالج میں میری ذہانت کا گراف گرنے لگا۔ اسکول میں تو اردو کی وجہ سے ذہانت (امتحان پاس کرنے والی) قائم تھی یہاں انگریزی نے اسے بھی ماند کر دیا۔ لہٰذا یہاں اسکول سے بھی بُرا حال ہوا میں کہیں نہ کہیں سے اردو کے نوٹس حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت بھی شاید میرا شعور اتنا بیدار نہیں ہوا تھا اس لئے میں اس حال میں بھی خوش تھا کہ یہاں سے نکل کر ڈاکٹر بن جائیں گے۔

بہرحال کالج کے ان دو سالوں میں مجھ میں علم حاصل کرنے یعنی کچھ جاننے کی جستجو پیدا نہ ہو سکی۔ ایک تو سائنسی مضامین اوپر سے انگریزی۔ ان حالات میں پڑھنے کو جی نہ چاہتا چونکہ ''اصل ذہانت'' پاس نہ تھی، اس لئے اگر کسی کتاب یا رسالے میں کوئی سائنسی مضمون یا ڈاکٹری سے متعلق جدید معلومات پڑھتا تو اکتا کر رکھ دیتا کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی تاریخی مضمون یا کہانی پڑھتا تو اسے پوری دلچسپی سے پڑھتا۔

بالآخر وہ دن آن پہنچے۔ یعنی امتحان کے دن۔ اس بار اسکول والی بات نہ تھی نتیجہ اس بار ویسا شاندار نہ آیا اور میں اتنے نمبر نہ حاصل کر سکا کہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکوں۔ تب میں نے ڈگری

کلاس میں داخلہ لے لیا۔ اب مجھ میں کچھ عقل آچکی تھی، اور یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں اب تک مقصد سامنے ہوتے ہوئے بھی بلامقصد پڑھ رہا تھا میں آنکھیں بند کر کے دوڑا جا رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ یہ راستہ میری منزل کی طرف جاتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں یہ کس طرح سوچ سکتا تھا کیونکہ میں نے تو اپنی منزل کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

انہی دنوں مجھ پر ایک ہولناک انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ ڈاکٹری سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اب میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ مجھے تو ڈاکٹر بننے کا شوق نہیں۔ انسان کو جس چیز کا شوق ہوتا ہے اس میں اسے دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ اسے مزید جاننے کی جستجو ہوتی ہے۔ مگر ڈاکٹری کے مضامین پڑھتے وقت مجھے اکتاہٹ ہوتی۔ میں خود پر جبر کر کے پڑھتا مگر کچھ پلے نہ پڑتا۔ اگر ابتدا میں کچھ صحیح پڑھا ہوتا بلکہ یوں کہیں کہ صحیح پڑھایا گیا ہوتا تو شاید کچھ دلچسپی پیدا ہو بھی جاتی مگر جب بسم اللہ ہی غلط ہوئی ہو تو انجام بخیر کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اس بات کو شدّت سے محسوس کرتا کہ جب کوئی غیر نصابی چیز پڑھتا ہوں تو اسے پوری دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ دوسری کتابیں میں پورے زور و شور سے پڑھتا ہوں مگر جب کورس کی کتابیں پڑھتا تو اٹکنے لگتا۔ انگریزی تو یہاں بھی اپنا کام دکھا رہی تھی مگر یہاں بھی میرا دوست "رٹا" مجھے بچا گیا۔ اگرچہ اب رٹتے وقت میں پریشانی محسوس کرتا اور سوچتا کہ یہ میں صحیح نہیں کر رہا مگر اب واحد راستہ یہی رہ گیا تھا اگر اب اسے اختیار نہ کرتا تو امتحان میں فیل ہو جاتا۔

اب کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ کاش بچپن میں میرے ذہن میں "تمہیں ڈاکٹر بننا ہے" کا ریکارڈ نہ چلا دیا جاتا تو ہوسکتا ہے میں کسی ایسے شعبے میں داخلہ لے لیتا جہاں میں اپنی دلچسپی سے پڑھتا اب تو مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ مجھے کس چیز کا شوق ہے۔ چڑیاں کھیت چگ کر اڑ چکی ہیں۔ وقت گزر چکا ہے۔ وقت .... جو واپس نہیں آتا۔

میری کہانی خاصی طویل ہو گئی مگر اب تو یہ ختم ہونے والی ہے۔ آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ تو جناب اس کہانی کا انجام ویسا ہی ہوا ہے جیسا اس قسم کی کہانیوں کا ہوتا ہے۔ میری کہانی ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ اور اس جیسی بہت سی کہانیاں ابھی جاری ہیں اور اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک ہمارے نظامِ تعلیم میں دوہرا معیار، طبقاتی نظام اور ہمارے والدین کا بچوں کے ذہن کو اپنی سوچ کے مطابق چلانے کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ میں آج کل اپنی ڈگری اٹھائے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

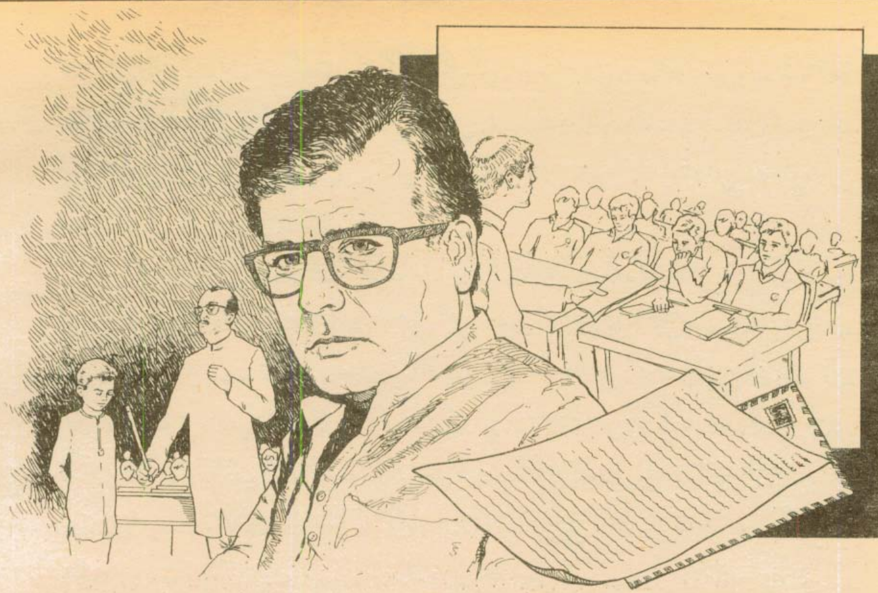

ہائے وہ دن

احمد حماد سعیدی

پیارے دوست ......!

آج ایک طویل مدت کے بعد تم نے اسکول کی زندگی کو یاد کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں اس زندگی کو فراموش کر چکا ہوں، وہ زمانے وہ لمحات بھول چکا ہوں ...... نہیں یہ غلط ہے۔ مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا سی باتیں، شرارتیں ...... میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں کبھی زندگی کی ڈگر پر سنجیدگی سے چل سکوں گا۔ اور اپنی ہنگامہ پسند طبیعت ترک کر دوں گا۔ مجھے اب تک یاد ہے وہ بہار کی جاتی سواری جب خزاں ہر شے پر قبضہ جمارہی تھی۔ میں اور تم ...... ہاں دوست ...... اس ندی کے کنارے بیٹھے اس پر سکون ماحول میں ایک دلچسپ پروگرام بنارہے تھے ...... اور پھر کس قدر فتح مندی سے شام کو چھٹی کے وقت ہم سیٹیاں بجاتے گنگناتے جارہے تھے مگر جلد ہی ہماری یہ خوشی غم میں بدل گئی اور ہم دونوں ماسٹر جعفری کے سامنے کھڑے

تھے تمہیں یاد ہے وہ منظر...... تم تو رو دیئے تھے یار...... تم تھے ہی نرے بدھو، اور سزا دلوانے والے بھی تو تم ہی تھے ورنہ کسی کو علم ہی نہ تھا کہ یہ کام ہم دونوں کا ہو سکتا ہے......

برسات کی وہ بھیگی بھیگی صبح جب ہم دونوں بے دلی سے کتابیں ہاتھ میں لئے اسکول جارہے تھے اور اس ندی کے کنارے جب ہم پہنچے تو میرا دل مچل گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاؤں مگر مجبوری...... ہم منہ بسورتے ہوئے اسکول جارہے تھے اور اسی دن کی آخری گھنٹی یاد ہے۔ کیسا دلچسپ پروگرام بنایا تھا اور تمہارے اس انکشاف نے ہم پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری کر دی تھی کہ ماسٹر فرخ چھٹی لے کر جا چکے ہیں۔ اور میں نے خوش ہو کر کہا تھا کہ ہو جائے کوئی گرما گرم پروگرام۔ اور پھر کلاس بند کر کے مشاعرے کی محفل سج گئی تھی۔ بڑے شعراء جمع تھے اور صدارت کے لئے اس ناچیز کا نام تجویز ہوا تھا۔ واللہ کیا دلچسپ محفل تھی اب یاد کرتا ہوں تو انگ انگ ناچ اٹھتا ہے۔ واہ واہ اور تالیوں کے شور میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا مگر اچانک دروازہ کھلا اور ماسٹر فرخ کا روشن چہرہ نمودار ہوا اور ایک لمحہ میں سب اپنی اپنی جگہ معصومیت کے مجسّمے بنے کھڑے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میز کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

"کیا ہو رہا تھا کلاس میں؟" وہ غصے سے بولے مگر جواب میں ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔

"میں کیا کہہ رہا ہوں؟" وہ دوبارہ گرجے۔ "میں ساری کلاس کو سزا دوں گا ورنہ شرارت کرنے والے کا نام بتاؤ۔" یہ دھمکی کارگر ہوئی اور کئی ایک نظریں میری جانب اٹھیں مگر میرے گھورنے پر سب کی سب نیچی ہو گئیں۔ وہ غصے میں کلاس سے باہر چلے گئے...... میں کتنا خوش تھا اور ہر لڑکے کو گلے لگا رہا تھا مگر میرے ہوش اڑ گئے جب میں نے دیکھا ماسٹر فرخ عین میرے سر پر کھڑے ہیں۔ یکایک ان کا ڈنڈا میرے سر کی بلائیں لینے کے لئے اٹھا "ادھر دیکھئے......" انجم چیخا اور تم او...... ہائے لہراتے دھم سے فرش پر گر پڑے وہ ادھر متوجہ ہو گئے اور میں یوں بچ گیا کہ ٹھیک اسی وقت گھنٹی بج گئی تھی پھر میں انجم اور تم ہنستے مسکراتے گھر آگئے...... مجھے ایک ایک بات یاد آرہی ہے ایک ایک شرارت اسکول کی یادیں میرے ذہن میں ابھر رہی ہیں...... مگر جانے دو...... کہاں تک دہراؤں۔

اب میں خود ایک استاد ہوں ماسٹر جعفری یا ماسٹر فرخ کی طرح نہیں بلکہ ایک زندہ دل استاد ہوں۔ اور اکثر بچے مجھ سے بہت قریب ہیں۔ وہ گھنے پیپل کے سائے میں سفید سفید بینچوں پر بیٹھ کر میرا تذکرہ کرتے ہیں شریر شریر ترین طلباء...... مگر ان کی شرارتیں دیکھ کر مجھے بے اختیار تم...... اور انجم یاد آجاتے ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے دوست کہ اسکول کی زندگی...... شرارتوں اور سزاؤں کا نچوڑ اور بڑا خوب صورت امتزاج ہوتی ہے...... اچھا خدا حافظ

تمہارا دوست ماسٹر احمد

مہمان نواز

بن یامین

ہاسٹل کی زندگی کا بھی عجیب لطف ہوتا ہے۔ جو لوگ ہاسٹل میں رہتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن یہ لطف ان لوگوں کے لئے دوبالا ہو جاتا ہے جن کو تعلیم مکمل کر کے اپنے گھر واپس جانا ہوتا ہے۔ سلیم کے خیال میں جن لوگوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا ان کی ساری زندگی ہی ہاسٹل کی مانند گزرتی ہے اور وہ زندگی کی یکسانیت سے اکتا جاتے ہیں۔ سلیم کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ بچپن میں ہی اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایک دور کے رشتہ دار نے اس کی پرورش کی لیکن میٹرک کرنے کے بعد سے سلیم نے اپنا خرچ خود اٹھانا شروع کر دیا تھا اور میٹرک کے بعد وہ مکمل طور پر ہاسٹل کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اگر دنیا میں اس کا کوئی گھر تھا تو وہ ہاسٹل ہی تھا اور اس کے ہاسٹلر دوست ہی اس کا خاندان تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آنے والی زندگی کا تصور ہی سلیم کے لئے اکتا دینے والا تھا۔

سلیم کے روم میٹ کا نام فراز تھا۔ اور سلیم کے برعکس وہ بھرے پُرے خاندان کا فرد تھا۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق پنجاب کے ایک گاؤں سے تھا۔ سلیم اور فراز میں اتنی دوستی تھی کہ اس کی مثال پورے ہاسٹل میں کیا پوری جامعہ میں ملنا مشکل تھی۔ روم میٹ ہونے کے علاوہ یہ دونوں کلاس فیلو بھی تھے۔ ان

دونوں کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا ایک ساتھ ہوتا تھا۔ جامعہ میں امتحانات کی آمد آمد تھی لہٰذا اس وقت دونوں ایک ساتھ بیٹھے اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ آخری سمسٹر ہونے کی وجہ سے دونوں کا زیادہ تر وقت پڑھائی میں صرف ہوتا تھا۔ اس سمسٹر کے بعد ان کی عملی زندگی شروع ہونی تھی۔ لہٰذا آرام کی غرض سے وہ چائے کے ایک ایک کپ پر ادھر ادھر کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔

"یار میں تو بس گھر کے متعلق ہی سوچ رہا ہوں امتحانات کے بعد جب گھر پہنچوں گا تو سب کتنے خوش ہوں گے، اماں، بابا اور بھائی۔" فراز نے کہا۔

"ہاں یار!" سلیم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "تم واقعی خوش قسمت ہو کہ کم از کم گھر والے تو تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے، ہماری راہ کون تکے گا؟"

"سوری یار۔ مجھے احساس ہے کہ میری بات سے تمہیں دکھ پہنچا۔" فراز جلدی سے بولا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ایسا کرو تم امتحانات سے فارغ ہو کر دو تین ہفتے کے لئے میرے گھر چلو۔ میرے گھر والے سب تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ یقین کرو ہمارے سب گاؤں والے اتنے مہمان نواز ہیں کہ کیا بتاؤں۔" فراز نے کہا۔

"بس بس زیادہ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔" سلیم بولا۔

"تم ایک بار میرے گھر تو چلو۔ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ میرے گھر والے کتنے مہمان نواز ہیں اور مجھ سے تو بہت ہی محبت کرتے ہیں۔ میرے دوست کو تو اپنے سر پر بٹھالیں گے۔" فراز نے کہا۔ "ظاہر سی بات ہے تم ساتھ ہو گے تو یہی ہو گا۔"

"چلو اسی بات پر شرط ہو جائے ایسا کرو امتحانات کے بعد میں کچھ عرصے کے لئے اپنے چچا کے ہاں کوئٹہ چلا جاؤں گا تم اکیلے میرے گھر چلے جاؤ۔ اگر مہمان نوازی کے معیار پر میرے گھر والے پورے اترے تو میں شرط جیت جاؤں گا ورنہ میں ہارا۔" فراز نے کہا۔

"اور یہ مہمان نوازی کا معیار کون طے کرے گا۔"

"کیا یاد کرو گے۔ یہ معیار میں تم پر چھوڑتا ہوں۔"

"اچھا۔ تو پھر طے" سلیم نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

فراز نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

آخری پرچہ دینے کے بعد سلیم نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ تفریح کرتا ہوا، گھومتا گھماتا فراز کے گھر پہنچے گا۔ امتحانات ختم ہونے کے دو دن بعد اس نے رخت سفر باندھا۔

رخصت ہوتے وقت فراز سے گلے ملا اور بولا۔

"آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارے گھر والے تم سے کتنی محبت کرتے ہیں اور تمہارے دوستوں کے لئے کتنے مہمان نواز ہیں۔"

فراز کے گاؤں پہنچ کر سلیم کے ذہن میں جو گاؤں کا خاکہ بنا ہوا تھا وہ پاش پاش ہو گیا۔ گاؤں سے تو اس کے ذہن میں بس یہ آتا تھا کہ ہر جگہ بھینسیں کھڑی ہوں گی اور ہر گھر کی دیواروں پر اپلے تھپے ہوں گے۔ ہر گھر کے باہر لالٹینیں لٹکی ہوں گی اور تمام راستے گوبر سے بھرے ہوں گے۔ اس کے برعکس یہ کافی صاف ستھرا گاؤں تھا کچھ مکانات پختہ اینٹوں سے بنے تھے اور کچھ مکانات مٹی کے تھے۔ اور تو اور اس گاؤں میں بجلی بھی موجود تھی۔ ایک آدمی سے اس نے فراز کے گھر کا راستہ معلوم کرنا چاہا تو اس نے راستہ سمجھانے کے بجائے خود ساتھ چلنا بہتر سمجھا اور سلیم کو فراز کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔

سلیم نے دروازے پر دستک دی تھوڑی دیر بعد تیرہ چودہ سالہ ایک لڑکا باہر نکلا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی سلیم سمجھ گیا کہ وہ فراز کا چھوٹا بھائی نواز ہے۔

"جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"نواز۔ میں فراز کا دوست سلیم ہوں اور ......"

ابھی سلیم اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بھاگتا ہوا گھر کے اندر گیا یہ کافی دیر تک باہر کھڑا رہا۔ اچانک پھر دروازہ کھلا اور ایک باریش آدمی باہر نکلے۔ وہ یقیناً فراز کے والد تھے۔

"آؤ بیٹا اندر آ جاؤ۔" انہوں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ان کے ساتھ چلتا ہوا وہ نشست گاہ میں آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد فراز کے والد نے نواز کو آواز دی اور اس کے آنے پر بولے۔

"بیٹا ان کے لئے فوری طور پر اسٹور کے ساتھ والا کمرہ صاف کروا دو اور ان کا سامان بھی وہیں رکھ دینا۔"

نواز سلیم کا سامان اٹھا کر چل دیا۔ سلیم نے محسوس کیا اس کے آنے کی وجہ سے ان کے گھر میں کچھ ہلچل مچ گئی ہے مگر کوشش کے باوجود سلیم اس ہلچل میں خوشی کا کوئی تاثر محسوس نہ کر پایا۔

کافی دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ سلیم سوچ رہا تھا کہ عجیب مہمان نواز لوگ ہیں کہ اپنے مہمان سے بات تک نہیں کر رہے۔ تھوڑی دیر بعد فراز کے والد کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ بولے۔

"بیٹا فراز تو ......"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ فراز کوئٹہ گیا ہوا ہے۔ دراصل میرا دل چاہ رہا تھا کہ امتحانات کے بعد

کی ان آخری چھٹیوں کو کسی گاؤں میں گزاروں فراز خود تو کوئٹہ چلا گیا مگر مجھے اصرار کر کے ادھر بھیج دیا۔ "

"اچھا، اچھا۔" وہ کہہ کر پھر خاموش ہو گئے۔

"بیٹا تم نہا دھو لو۔ پھر دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے وقت سلیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے فراز کے گھر والے آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں ان سرگوشیوں میں سلیم صرف فراز کا نام واضح طور پر سن سکا۔

کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد سلیم سو گیا۔ دروازے پر دستک سے آنکھ کھلی دروازہ کھول کر دیکھا تو فراز کا چھوٹا بھائی نواز کھڑا تھا۔

"سلیم بھائی! کھانا کھالیں"۔

سلیم اس کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف چل دیا۔ فرشی دسترخوان کے گرد فراز کے گھر والے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں پر اس کی ملاقات فراز کی والدہ اور بڑے بھائی شہباز سے بھی ہو گئی۔

کھانے کے دوران خاموشی برقرار رہی۔ کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"ماں جی۔ فراز ہماری کلاس کا سب سے ذہین لڑکا ہے۔" سلیم نے فراز کی والدہ کو خوش کرنے کے لئے دانستہ جھوٹ بولا۔

"اچھا۔" فراز کی والدہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔

"ماں جی فراز آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ روزانہ ہی کسی نہ کسی حوالے سے آپ کا ذکر آ ہی جاتا ہے۔"

فراز کی والدہ کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ گئیں۔ سلیم حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

سلیم کو وہاں رہتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہفتہ گذر گیا۔ اس دوران فراز کے گھر والوں نے اس کی خاطر میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی تھی۔ وہ اس کی ذرا ذرا سی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ سلیم کو اندازہ ہو گیا کہ فراز نے اپنے گھر والوں کے متعلق کچھ غلط نہ کہا تھا۔ مگر اس کا یہ دعویٰ غلط معلوم ہوتا تھا کہ اس کے گھر والے اس سے بے انتہا محبت کرتے ہیں کیونکہ اس دوران کسی نے فراز کا تذکرہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے برعکس کبھی سلیم اس کا تذکرہ کرتا تھا تو اس کی باتوں کا رخ موڑ دیا جاتا تھا۔ سلیم کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فراز کے گھر والے فراز سے محبت کرنے کے بجائے کسی بات پر اس سے ناراض ہوں۔

حتیٰ کہ فراز کا بڑا بھائی شہباز کئی بار ڈھکے چھپے الفاظ میں اس سے یہ کہہ چکا تھا کہ والدین کے سامنے

وہ فراز کے تذکرے سے پرہیز کرے تنہائی میں البتہ وہ دونوں مل کر فراز کے معمولات کے متعلق خوب باتیں کرتے تھے۔ سلیم نے کئی بار اس سے کریدنے کی کوشش کی وہ فراز سے کیوں ناراض ہیں مگر وہ ہر بار اس ذکر کو ٹال جاتا تھا۔ بالآخر سلیم کی روانگی کا دن آگیا اور وہ فراز کے گھر والوں کے ساتھ آخری ناشتا کر رہا تھا سلیم پہلے ہی سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ آج ان کے گھر والوں سے ان کے طرز عمل کے بارے میں دوٹوک بات کرے گا۔

"آج چونکہ میں یہاں سے جارہا ہوں لہٰذا یہ بات بتا دوں کہ میں فراز سے شرط لگا کر یہاں آیا تھا۔" وہ بولا، "فراز کا دعویٰ تھا کہ اس کے گھر والے بہت مہمان نواز ہیں اور خصوصاً اس سے اور اس کے دوستوں سے تو بہت محبت کرتے ہیں۔ اس کا پہلا دعویٰ تو درست ثابت ہوا مگر جہاں تک اس سے محبت کرنے کا تعلق ہے تو میں نے محسوس کیا ہے آپ لوگ تو اس کے تذکرے تک کے روادار نہیں ہیں۔ میں نے کئی بار آپ سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے ٹال دیا۔ خیر واپس جا کر میں خود اس سے معلوم کرلوں گا۔"

"بیٹا۔ اب وہ تمہیں نہیں ملے گا۔" اس کی والدہ نے کہا۔ اور پھر اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "کیوں کیا مطلب؟" سلیم بوکھلا گیا۔

"بیٹا تم جس دن وہاں سے روانہ ہوئے ہو۔ اسی دن فراز کا ایکسڈینٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی میت کے ساتھ یونیورسٹی کے دوسرے لڑکے بھی آئے تھے مگر تم شاید راستے میں تھے اس لئے تمہیں اطلاع نہ ہو پائی۔" اس کے والد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا۔ میں تو اس کا بہترین دوست تھا؟" سلیم نے اپنے بال نوچتے ہوئے کہا۔

"بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو۔ وہ ہر خط میں تمہارا تذکرہ کرتا تھا۔ میں نے اسی لئے تمہیں نہیں بتایا کہ تم یہ خبر سن کر تڑپ اٹھو گے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں عملی زندگی شروع کرنے سے پہلے تفریح کے جو چند لمحات ملے تھے وہ کتنے قیمتی تھے۔ میں تم سے انہیں چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ تمام گاؤں والوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ تمہیں یہ خبر نہ ملے۔ رہی یہ بات کہ ہم اس کے تذکرے تک کے روادار نہ تھے تو بیٹا تمہیں ابھی اندازہ نہیں ہے کہ جوان مردہ بیٹے کے متعلق گفتگو کرنا کتنا مشکل کام ہے۔" فراز کے والد نے کہا۔ سلیم سر پکڑ کر رہ گیا اب وہ کسے جا کے بتاتا کہ فراز کے گھر والے اس کی مہمان نوازی کے معیار کے مطابق نہیں تھے بلکہ ان کی مہمان نوازی اس سے کہیں زیادہ بلند تھی۔ کہیں زیادہ بلند۔ (مرکزی خیال انگریزی کہانی سے ماخوذ)

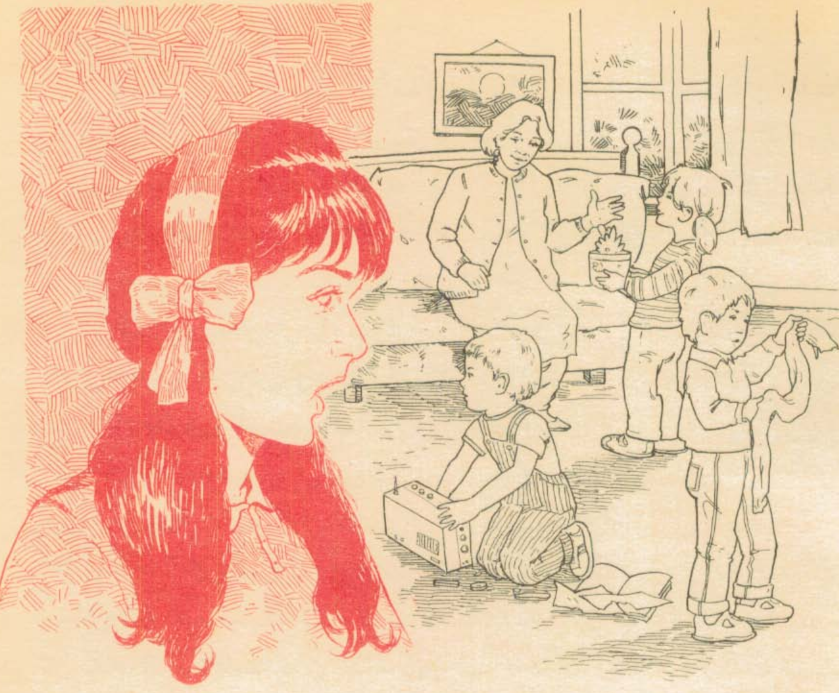

مائیں کیسی کیسی

نائلہ صدیقی

آنکھ مچولی کے اطفال نمبر کے اعلان میں ایک جملہ کچھ یوں تھا کہ آپ نے اپنے وطن کے بچوں کو کس نظر سے دیکھا۔ ؟ ہمیں معلوم ہے کہ اس اعلان کے جواب میں بہت سے ایسے مضمون اور کہانیاں موصول ہوئی ہوں گی جن کا لب لباب یہ ہوگا کہ بچے پھول ہوتے ہیں، بچے معصوم ہوتے ہیں اور بچے فرشتہ ہوتے ہیں، ہمیں ان سب باتوں سے اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مائیں کیسی ہوتی ہیں جو اپنے غلط رویئے اور بے جا لاڈ و پیار سے ان پھولوں کو کانٹوں اور معصوم فرشتوں کو جنگلی مخلوق میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں مائیں کیسی کیسی؟

یہ بات آپ کے مشاہدے میں بھی آئے گی کہ اکثر والدین اپنے بچوں کو مہمانوں کا صبر آزمانے کے لئے بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں یعنی جونہی کوئی مہمان گھر میں داخل ہوا ماں نے اپنے بچے کا سوئچ آن کر دیا اور یہ سوئچ اس جملے سے آن ہوتا ہے ''بیٹا! آنٹی/انکل کو گنتی سناؤ یا بلی کی آواز نکال کر دکھاؤ وغیرہ وغیرہ اگر بچے شرمیلے ہوں تب تو مہمان محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن اگر بچے بولڈ اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہیں تو جب تک دنیا کے تمام جانوروں کی آوازیں اور اسکول کا کورس مہمان کی سماعت میں نہ انڈیل دیں تب تک مہمان کی واپسی محال ہوتی ہے یا پھر والدہ محترمہ خود ہی فرماتی ہیں ''پتہ ہے گڈو دادا کو تاتا کہتا ہے، ہی ہی ہو ہو ہاہا۔'' اب آپ ہی سوچئے کہ اس جملے کے بعد ہنسنے کی ذمہ داری مہمان پر کیونکر عائد ہوتی ہے۔؟ ایک جانثار ماں، عقیدت مند باپ اور رحمدل خالہ یا پھوپھی تو ان جملوں کو سن کر ہنس سکتے ہیں ایک اجنبی مہمان یہ بھاری ذمہ داری کس طرح ادا کرتا ہے...... یہ بچوں کے والدین کو اندازہ نہیں ہو سکتا اسی طرح اگر کوئی بچہ چٹکی بجانے کی منحوس عادت میں گرفتار ہو چکا ہے تو مہمانوں کی خیر نہیں، جب تک والدین مہمانوں کے سامنے بیس پچیس مرتبہ چٹکی بجوا کر نہ دکھادیں ان کے دل کو قرار نہیں آتا۔ ادھر والدین بچے کے چٹکی بجانے کے کرتب پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں ادھر مہمان بچے کو چٹکی کاٹنے کی آرزو دل میں لئے جبراً جبڑے پھیلائے بیٹھا ہے لہٰذا تمام والدین سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ آئے گئے کے سامنے اپنے بچوں کے کارنامے، شرارتیں اور معصوم اداؤں کا فرمائشی پروگرام نہ شروع کر دیا کریں ورنہ پڑوسیوں اور آنے جانے والوں سے آپ کے تعلقات خراب ہوں گے اور وہ آپ کے بچوں کی شکل دیکھنے سے بھی کترائیں گے۔ کم از کم ہم نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اب ہم بچوں والے گھروں میں اسی وقت جائیں گے جب یہ بچے کتے بلی کی آوازیں نکالنے سے تائب ہو جائیں گے کیونکہ اس سلسلے میں ہمیں ایک تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک نئے محلہ دار سے ملنے گئے، ابھی سلام دعا اور تعارف کا سلسلہ جاری تھا کہ کمرے میں دنیا کا سب سے موٹا بچہ داخل ہوا بچے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی محترمہ نے ہمارے خلاف ایک گھناؤنی سازش کی اور بچے سے فرمائش کی ''بیٹا! آنٹی کو پوئم سناؤ'' محترمہ کا لخت جگر اشارہ ملتے ہی بلا تاخیر گرجنے لگا ہم دم بخود رہ گئے بچے کا گرجنا برسنا ختم ہوا تو پتا چلا کہ یہ پوئم سنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

''دیکھا میرا بیٹا کتنا ذہین ہے۔؟ میں تو اسے لندن بھیج دوں گی۔'' محترمہ ایک ادا سے بولیں۔

''جی ضرور! آخر انگریزوں سے سو سالہ غلامی کا بدلہ بھی تو لینا ہے۔'' ہم نے دل میں سوچا

''بیٹا! گدھے کی آواز نکال کر بتاؤ۔'' محترمہ کی فرمائش ہماری سماعت پر بم بن کر گری۔ اچانک کمرہ

کسی ان پڑھ گدھے کی بھیانک چیخوں سے گونج اٹھا، فرماں بردار بچہ بلا توقف پوری قوت سے گدھے کی پیروڈی پیش کر رہا تھا۔

"اصل میں اس میں پیروڈی کا شوق ابھر رہا ہے۔" والدہ نے بچے کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا

"اسے کچل دیجئے۔" ہم نے بچے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اسے؟" محترمہ نے بچے کو کھینچ کر سینے سے چمٹالیا۔

"نہیں میرا مطلب ہے شوق کو، اگر ابھی سے اس قسم کے چکروں میں پڑ گیا تو تعلیم کیسے حاصل کرے گا، ویسے تعلیم اس کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتی مگر پھر بھی۔" ہم نے آدھا جملہ دل میں مکمل کیا۔

اتنے میں محترمہ یہ کہتے ہوئے "آپ گڈو سے باتیں کیجئے، میں ابھی آئی۔" دوسرے کمرے میں لپک گئیں۔

ان کے جاتے ہی ہم نے بچے کی طرف متوجہ ہوئے جو گدھا بن کر پورے کمرے کو سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔

"اے خاموش ہو جاؤ" ہم دبی دبی آواز میں دھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"الّو کہیں کی تم کیوں نہیں خاموش ہوتیں۔؟" بچّہ گدھے کے روپ سے باہر نکل کر چیخا۔

"کک کیا۔"؟ ہم سکتے میں رہ گئے "بب بیٹا ادھر آؤ، گود میں بیٹھو۔" ہم سکتہ ٹوٹنے پر پیار سے بولے بچے نے گود میں بیٹھتے ہی ہماری ناک پکڑ کے آکسیجن کی سپلائی روکنے کی مذموم کوشش کی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور جھٹ بچے کے بازو پر ایک زور دار چٹکی لی۔ بچہ دھاڑیں مار مار کر ہنسنے لگا۔

ہنس کیوں رہے ہو۔"؟ ہم نے قہر آلود آواز میں پوچھا۔

"میں رو رہا ہوں اُلو کی دم۔" بچہ چلایا اس آہ و بکا کے نتیجے میں ان کے والد صاحب تشریف لائے اور بچے کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ اتنے میں والدہ صاحبہ بھی آدھمکیں اور مسکرا کے بولیں "گڈو بڑا ڈرپوک ہے، اجنبیوں سے ڈرتا ہے آپ سے ڈر کر رونے لگا۔" ہم یہ بہتان سن کر دھک سے رہ گئے اور .... اس دن کے بعد سے ہم ان کے گھر دوبارہ نہیں گئے۔

اسی طرح کچھ مائیں ایسی ہوتی ہیں جو بچوں کے ہمراہ کسی کے گھر جاتی ہیں تو بچوں کو میزبان پر چھوڑ دیتی ہیں، ہمارا مطلب ہے کہ بچوں کو دیکھنے بھالنے اور روک ٹوک کی ذمہ داری سے برّی الذّمہ ہو کر اطمینان سے محوِ گفتگو ہو جاتی ہیں بچے گھر کے کونے کونے میں گھس کر ایسی تباہی مچاتے ہیں کہ الامان اور مائیں یوں بے نیاز بیٹھی ہوتی ہیں جیسے یہ بچے وہ اپنے ساتھ نہیں لائی تھیں بلکہ ہمارے گھر خود بخود اگ آئے تھے۔

مثلاً ایک انتہائی شریر بچے نے (بقول ان کی والدہ) ہماری بہن کی گھڑی اٹھا کر باؤنڈری سے باہر سڑک پر پھینک دی، والدہ صاحبہ یہ منظر دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑیں پھر بچے کو روکنے کے بجائے ہنسی روکتے ہوئے بولیں "اس کی تو یہی عادت ہے، ہر چیز اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے" ہمارا تو دل چاہا کہ بچے کو دو تھپڑ ماریں اور کہیں "ہماری بھی یہی عادت ہے۔" اسی طرح ایک صاحبہ اپنے ان گنت بچوں کے ساتھ ہمارے گھر تشریف لائیں۔ بڑی بیٹی صاحبہ آتے ہی بے تکلفی پر اتر آئیں اور ہمارے تکیے کے نیچے سے آنکھ مچولی نکال کر پڑھنے لگیں۔ اب ذرا ماں کی ممتا ملاحظہ فرمایئے فرمانے لگیں "ارے اسے تو رسالے پڑھنے کا بڑا شوق ہے بھئی آرام سے گھر جا کر پڑھنا یہاں بیٹھے بیٹھے کیا پڑھ رہی ہو . . . ہمارے اوپر بجلی سی گر پڑی، مدد طلب نظروں سے امی کو دیکھا وہ بھی ممتا کے اس مظاہرے پر انگشت بدنداں تھیں مجبوراً دل پر پتھر رکھ کر مسکرا دیئے اور آنکھ مچولی کا وہ شمارہ ان کی نذر ہو گیا۔

کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر گھر کی خاص خاص اشیاء مثلاً ریڈیو، گھڑیاں، کتابیں وغیرہ برق رفتاری سے چھپانے پڑتے ہیں یہ تجربہ یوں ہوا کہ ایک بچے صاحب آتے ہی ہمارے ریڈیو پر ٹوٹ پڑے ادھر صاحب زادے ریڈیو کے انجر پنجر ڈھیلے کر رہے ہیں ادھر والدہ صاحبہ فرما رہی ہیں۔

"ارے بیٹے مت کرو، اوہو منع کر رہی ہوں نا چندا، جانو کیا شرارت ہے۔؟" اگر اس وقت وہ یہ پیار بھرے جملے ارشاد فرمانے کے بجائے بچے کو ایک زبردست ڈانٹ پلاتیں یا اس کے کان کھینچ لیتیں تو بہتر اثر ہوتا مگر .... اب ہمارا ریڈیو، ریڈیو کہلانے کے اعزاز سے محروم ہو چکا تھا اور اب کوئی مار کوٹی اسے ریڈیو کی شکل نہیں دے سکتا تھا، اتنے میں صاحب زادے ٹی وی کی طرف بڑھے، ہم نے کپکپا کر ان کی والدہ کو رحم طلب نظروں سے دیکھا تو انہوں نے ارشاد فرمایا "ارے بھئی اسے (موصوف بچے کو) انجینئر بننے کا شوق ہے، بڑا ہو کر انجینئر بنے گا" تو کیا انجینئرنگ کا سارا کورس ہمارے ہی گھر میں پورا کرے گا۔؟ ہم نے جل کر سوچا۔

غرض قارئین! ان تمام تجربوں اور مشاہدوں کے بعد ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچے حقیقتاً معصوم ہوتے ہیں اگر ان میں کوئی بری بات یا غلط عادت پائی جاتی ہے تو اس کے لئے صرف اور صرف والدین خطا وار ہیں اگر والدین بالخصوص مائیں بچوں کی بدتمیزیوں پر مناسب رد عمل کا اظہار کریں اور بچوں کو صرف زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر اس بات کا احساس دلائیں کہ فلاں بات غلط ہے اور بے جا لاڈ و پیار سے گریز کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بچے تمیز دار نہ ہوں کیونکہ بچوں کی شرارتیں تو سب کو اچھی لگتی ہیں لیکن شرارت جب بدتمیزی یا غلط عادت کے دائرے میں داخل ہونے لگتی ہے تو ناپسندیدہ فعل بن جاتی ہے، اس لئے کوشش کیجئے کہ آپ کے بچے شریر ہوں بدتمیز نہیں۔

کم سن قلم کار

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہو سکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

حمد

کامران طارق ...... پشاور

تیرے سوا کسی کو سجدہ کہاں روا ہے
تیرے سوا کسی کو پوجیں تو یہ خطا ہے

خالق ہے تو ہمارا — اے حاکموں کے حاکم تیری ہے بادشاہی
مالک ہے تو ہمارا — ہر چیز دے رہی ہے اس بات کی گواہی
تو نے ہمیں بنایا — پھل، پھول، پیڑ، پتّے، میداں، پہاڑ و دریا
تو نے ہمیں سنوارا — کرتے ہیں صدقِ دل سے تیری ثناء خدایا

نکمّی چیز

محمد سلیمان رشید

آج کا سارا دن میرے لئے بڑا ناخوشگوار گزرا صبح دیر سے آنکھ کھلی اور باوجود سارے کام جلد از جلد نمٹانے کے مجھے اسکول کے لئے دیر ہوگئی ہیڈ ماسٹر صاحب کا لیکچر اور فائن بھرنا پڑا۔ کلاس میں پہنچا تو ہمارے حساب کے ماسٹر ہوم ورک چیک کر رہے تھے بیگ کھولا تو کاپی غائب یاد آیا وہ تو جلدی میں میز پر ہی رہ گئی۔ ہر طرح عالی جناب ماسٹر صاحب کو یقین دلایا کہ بھول ہوگئی کاپی نہ لاسکا مگر ان کی نظر میں یہ بہت پرانا بہانا تھا۔ جسے سنتے سنتے وہ عاجز آگئے تھے۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ انہوں نے بھی سزا دی کلاس میں بے عزتی ہوئی اور میں دوستوں کے مذاق کا نشانہ بنا۔ انہی سوچوں میں غلطاں گھر کی جانب رواں تھا کہ پتھر سے ٹھوکر لگی اور میں چاروں شانے چت کر گیا۔ راہ گیر چہرے پر مسکراہٹیں سجائے قریب سے گزرنے لگے اور میں درد اور جھنجھلاہٹ سے بھرپور چہرہ لئے گھٹنے پر چوٹ سجائے گھر پہنچا امی نے جو یہ حالت دیکھی تو پریشان ہوگئیں مجھے بستر پر لٹادیا زخم صاف کیا اور پٹی کرنے لگیں اسی دوران میری رام کہانی سنی اور مجھے تسلی دی اور باورچی خانے میں چلیں گئیں واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں مصری کی ایک ڈلی تھی میری قسمت ہوئی میں نے امی سے مصری کی ڈلی لے لی مگر معلوم ہوا کہ وہ مصری نہیں پھٹکری تھی ایسی غلطی یا غلط فہمی کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میرے منہ کا ذائقہ اور کریلے کی کڑواہٹ یکساں ہوگئی۔

اب میں لیٹا پتھروں کے متعلق سوچ رہا تھا آخر اس چیز کا کیا کام ہے کیونکہ میں جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بغیر مصرف کے نہیں بنائی ہر چیز کسی نہ کسی طرح ہمارے کام آتی ہے یہ پتھر کس لئے بنائے گئے ہیں ایک بار خیال آیا کہ امی سے پوچھ لوں مگر پھر سوچا کہ اس طرح مزا نہ آئے گا۔ یہ مسئلہ ہم خود حل کریں گے مابدولت کا کوئی تحقیقاتی کام دنیا کے سامنے آئے گا جب ہی تو دنیا ہمیں محقق مانے گی۔ کافی سوچنے کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ پتھر ہم ایک دوسرے پر برسا سکتے ہیں یعنی جس سے آپ کی لڑائی ہو اس پر ایک اور کام ان پتھروں سے

ہو سکتا ہے وہ ہے احتجاج کے موقع پر پتھراؤ احتجاج کا بہترین طریقہ پتھراؤ ہے جب تک نقصان نہیں ہو گا احتجاج کا اثر کیسے ہو گا۔ نہ جانے کتنی اور دلیلیں تھیں جن سے میں نے اپنے آپ کو کافی مطمئن کر لیا دوسرے دن چوٹ کی وجہ سے اسکول نہ جا سکا۔

چوٹ کا درد کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اور مجھے امید تھی کہ میں اگلے دن اسکول جانے کے قابل ہو جاؤں گا دوپہر کو امی نے مجھے پیسے دیئے اور بازار جانے کو کہا لاکھ انکار کرنے کے باوجود امی نے کوئی بہانہ سننے سے انکار کر دیا اور مجھے مجبوراً بازار کی طرف جانا پڑا۔ بازار میں خاصا رش تھا مگر خریداروں کی زیادہ تعداد عورتوں پر مشتمل تھی میں اپنی مطلوبہ دکان پر پہنچ کر چیزیں خریدنے لگا تمام کام سے فارغ ہو کر جب میں واپس آنے لگا تو اسی لمحے دو لڑکے موٹر سائیکلوں پر سوار ایک عورت کا پرس چھین کر بھاگے اور تقریباً میرے سامنے سے گزرے جانے کیوں اسی لمحے میرے ذہن میں پتھر کا خیال آیا .... میں نے تیزی سے جھک کر پتھر اٹھایا اور موٹر سائیکل پر سوار لڑکوں کو دے مارا پتھر نشانے پر لگا وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور زمین پر آ رہے یہی وہ لمحہ تھا جب راہ گیر اور دکان داروں نے انہیں جا لیا اب مجھے پتھر بے کار چیز نہیں لگتے میں سوچتا ہوں کہ ان کے اور بھی بہت سے استعمال ہوں گے جو مجھے معلوم نہیں ہیں (بے شک اللہ کی بنائی ہوئی کوئی شے بے کار نہیں)

جانوروں کی دنیا

مرسلہ۔ محمد مسعود الرحمان ملتان

دودھ دینے والے جانوروں میں سب سے کم دودھ ہتھنی دیتی ہے۔

زرافے کا خطرناک ترین دشمن شیر ہے۔

گھوڑا اپنے وزن سے پانچ گنا زیادہ بوجھ کھینچ سکتا ہے۔

کچھوے کی تیز ترین رفتار پانچ گز فی منٹ ہے۔

ہاتھی کے دوڑنے کی تیز ترین رفتار تقریباً تیس میل فی گھنٹہ ہے۔

ڈولفن کو سمندر کا کھلاڑی کہا جاتا ہے۔

شکرا ہوا میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

سائنس دانوں نے سب سے زیادہ تجربات شہد کی مکھی پر کئے ہیں۔

دنیا میں تین رنگوں کے مود پائے جاتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت کبوتروں کی ۲۷۹ قسمیں پائی جاتی ہیں۔

کرسٹوفر کولمبس

محسن علی قاسمی ...... کراچی

کرسٹوفر کولمبس کا نام آتے ہی نئی دنیا امریکہ کا خیال آتا ہے جس کو اس نے دریافت کیا۔ وہ اٹلی کی بندرگاہ جینوا میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن سے جہاز رانی کے قصے کہانیاں شوق سے پڑھتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے

دل میں جہاز پر سفر کرنے اور نئے نئے ممالک دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس کی تسکین کے لئے اس نے جہاز پر ملازمت کر لی۔ بیس برس کی عمر میں اس نے اٹلی کو چھوڑ کر پرتگال میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی دولت اور خوشحالی کے چرچے پوری دنیا میں عام تھے۔ ہر ایک اس ملک میں جانے کا خواہشمند تھا۔ مگر وہاں جانے کا سمندری راستہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ مشرق کی سمت میں ہے۔ کولمبس کو بھی ہندوستان جانے کا شوق ہوا وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ زمین گول ہے اس لئے اس کا خیال تھا کہ اگر ہم مغرب کی طرف سفر کریں تو کسی نہ کسی دن ہندوستان پہنچ سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر اس نے ہندوستان جانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس انجانے سفر کے لئے ملاح، جہاز اور دیگر سامان حاصل کرنا کولمبس کے بس کی بات نہ تھی۔ صرف پرتگال کا بادشاہ ہی اس کا بندوبست کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں اس نے اس قسم کی مہم جوئی کا اپنے ملک میں آغاز کیا تھا۔ کولمبس نے بادشاہ سے مدد مانگی مگر اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ مایوسی کی حالت میں وہ پرتگال سے اسپین جا بسا اور وہاں کے حکمراں سے مدد چاہی، اسپین کی ملکہ ازابیلا نے اس کی مدد کی اور اس کو تین چھوٹے جہاز اور ملاح دیئے اور اس کے علاوہ راستے کے اخراجات کے لئے رقم فراہم کی۔ کولمبس ۱۴۹۲ء کے ماہ اگست میں اسپین سے روانہ ہوا۔ اس کی منزل برصغیر تھی۔ کافی سفر طے کر لینے کے بعد بھی زمین کا کوئی نام و نشان نہ ملا۔ موسم کی خرابی اور طوفانوں نے برا حال کر رکھا تھا۔ سب ملاح مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن کولمبس ان کو تسلی دیتا رہا اور ان کے حوصلے بلند کرتا رہا۔ آخر کار وہ ایک جزیرے میں پہنچ گئے۔ کولمبس سمجھا کہ شاید ہم اپنی منزل برصغیر ہند کے کسی مغربی جزیرے میں آگئے ہیں۔ اس لئے ان جزیروں کو اس نے "عرب الہند" کا نام دیا۔ جہاز سے اتر کر زمین کو چوما اور اسپین کا جھنڈا لگایا، جس جگہ پر اس نے اسپین کا پرچم لہرایا اس کا نام "سان ڈیاگو" رکھا۔ کولمبس نے مقامی لوگوں کا نام ریڈ انڈین رکھا۔ کیونکہ ان کا رنگ تانبے کی طرح تھا اور اپنے خیال کے مطابق وہ انہیں انڈین یعنی ہندی سمجھا تھا۔ اسپین سے کولمبس برصغیر کی تلاش میں نکلا تھا۔ مگر وہ وہاں جانے کے بجائے ایک ایسی جگہ جا پہنچا جسے پہلے کسی نے نہ دیکھا اور نہ ہی سنا تھا۔ اس طرح ایک نئی دنیا کی دریافت کا عظیم کارنامہ کرسٹوفر کولمبس کے حصے میں آیا۔ بعد میں اس نئی دنیا کو شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کا نام دیا گیا۔ کولمبس وہاں پانچ ماہ ٹھہرا اور اس کے بعد وہ واپس اسپین چلا گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آلو، تمباکو اور مکئی امریکہ سے لایا تھا اور اب یہ تمام اشیاء ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔

گمشدہ انگشتانہ

(ایک غیر ملکی کہانی)

صائمہ سلیم ...... سعودی عرب

جینی کے پاس ایک نہایت خوبصورت کڑھائی کا کام کرنے والی ٹوکری تھی جو اسے اس کی دادی نے دی تھی۔ وہ ٹوکری ہر قسم کی سوئیوں، قینچی، سبز، سفید، سرخ، نیلے اور پیلے دھاگوں اور ایک پن کشن پر مشتمل تھی۔ لیکن ان سب چیزوں سے منفرد اور خوبصورت جینی کا چاندی کا انگشتانہ تھا۔ یہ انگشتانہ جینی کو اس کی امی

(مسز جارج) نے سالگرہ پر دیا تھا۔ وہ خالص چاندی کا بنا ہوا تھا اور جینی کی بیچ کی انگلی میں اچھی طرح فٹ ہو جاتا تھا۔ جینی کو وہ انگشتانہ اتنا پسند تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری چیزوں سے بالکل لاتعلق ہو جاتی تھی۔

ٹومی ایک کوا تھا جسے اس کے بچپن میں جینی کے ابو (مسٹر جارج) نے زمین پر گرا ہوا اٹھایا تھا۔ چمکتی ہوئی چیزیں ٹومی کی کمزوری تھیں۔ ہر ایک کو اپنی چیزیں اس سے بچا کر رکھنا پڑتی تھیں۔ ٹومی کی موجودگی میں جینی بھی اپنی ٹوکری خاص طور پر انگشتانے کا بہت خیال رکھتی تھی۔ مسٹر جارج اکثر ٹومی کے گھونسلے سے متعدد چیزیں جو کہ اس نے گھر سے چرائی ہوئی تھیں اٹھایا کرتے تھے۔ ان میں سفید چمچ، ہار، سکے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔

جینی ہمیشہ اپنے انگشتانے کو احتیاط سے رکھتی تھی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ انگشتانہ اسے بہت پسند تھا۔ اور دوسری یہ کہ کبھی کبھار جب وہ اسے پہن کر سلائی کا کام کرتی تو ٹومی انگشتانے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ مگر ایک دن جینی نے اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے اپنا دلعزیز انگشتانہ کھو دیا۔

ہوا یوں کہ ایک دن جینی کی آنٹی سوسن ان کے گھر تشریف لائیں۔ جینی ان سے ملنے کے لئے اپنا انگشتانہ اور دوسرے پلنگ پر ہی چھوڑ گئی اور جلدی میں کھڑکی میں بیٹھے ہوئے ٹومی کو بھی نہ دیکھ سکی۔ ٹومی جو یہ کافی دیر سے انگشتانہ چرانے کے چکر میں تھا۔ آج اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں۔ جب اسے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے تو وہ اطمینان سے انگشتانہ چونچ میں دبا کر اڑا اور باورچی خان کی کھڑکی میں جا بیٹھا۔ باورچن کرسمس پڈنگ بنانے میں مصروف تھی اور اس نے کوے کو دیکھا نہیں تھا۔ باورچن کے پاس

متعدد چاندی کی چیزیں پڑی تھیں۔ جن میں پانچ، بیس، پینس کے سکے، کھلونے کا ہاتھی، گڑیا اور ایک چمکتی ہوئی انگوٹھی شامل تھی۔ یہ تمام چیزیں کرسمس پڈنگ میں ڈالنے کے لئے رکھی تھیں۔ کرسمس پر ہر کوئی اس وقت بہت خوش ہوتا جب پڈنگ میں سے کسی کو کوئی شے ملتی۔

جب ٹومی نے باورچن کو مختلف چیزیں پڈنگ میں ڈالتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھا کہ باورچن انہیں چھپا رہی ہے۔ ٹومی جو کہ پہلے ہی انگشتانے کو چھپانے کے چکر میں تھا، نظر بچا کر اڑا اور اسے پڈنگ میں ڈال دیا اور سوچنے لگا کہ اس سے اچھی جگہ اور کہاں ملے گی؟

ادھر جب جینی آنٹی سے مل کر واپس آئی تو اپنا انگشتانہ نہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مگر مایوس ہوئی۔ جب کافی کوشش کے بعد نہ ملا تو روتے ہوئے کہنے لگی! "ہو نہ ہو یہ ضرور ٹومی کی

شرارت ہے۔ " لیکن جب مسٹر جارج نے گھونسلہ دیکھا تو وہ خالی تھا۔ اب تو جینی اور بھی اداس ہو گئی۔ اداس کیوں نہ ہوتی آخر وہ انگشتانہ اسے بہت پسند تھا۔ اور پھر وہ اسے اس کی امی نے دیا تھا۔ جو چیز امی نے دی ہو اسے کس طرح بھلایا جا سکتا ہے ؟

" شاید تمہیں اس طرح کا انگشتانہ کرسمس پر کوئی دے دے! " مسز جارج نے جینی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

" مگر وہ اتنا اچھا تو نہ ہو گا جتنا کہ آپ نے مجھے دیا تھا۔ وہ اچھا سینے میں میری بہت مدد کرتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ میں کسی اور انگشتانے سے اتنا اچھا نہ سی سکوں گی۔ " جینی نے روتے ہوئے کہا۔

مسز جارج نے جینی کو تسلی دی اور آنٹی سوسن سے جینی کو کرسمس پر نیا انگشتانہ دینے کے لئے کہا۔ کیوں کہ وہ خود جینی کو نئی گڑیا دینا چاہتی تھیں۔ آنٹی سوسن نے ان سے وعدہ کر لیا۔ مگر جب کرسمس آیا تو آنٹی سوسن انگشتانہ بھول گئیں اور اس کی بجائے انہوں نے جینی کو ایک کہانیوں کی کتاب تحفے کے طور پر دی۔ اسی وجہ سے جینی کرسمس پر خوش نظر نہ آ رہی تھی۔

جب کھانے کا وقت آیا تو ایک بہت بڑا ترک مرغ پیش کیا گیا جسے کھانے کے لئے بہت سے لوگ موجود تھے۔ مثلاً دادا ، دادی جین کے دو کزن اور خود جینی اور اس کے والدین کھانے کے بعد جب باورچن کرسمس پڈنگ لے کر آئی تو سب بے حد خوش ہوئے۔

" کاش ! مجھے پانچ پینس مل جائیں۔ " کزن ڈیوڈ نے خوش ہو کر کہا۔

" کاش ! مجھے بیس پینس مل جائیں۔ " کزن جم نے خوش ہو کر کہا۔

" شاید مجھے ننھا ہاتھی مل جائے! " جینی نے کہا۔ اور جب سب نے اپنی اپنی پلیٹوں میں پڈنگ ڈال لی تو مسٹر جارج نے خوش ہوتے ہوئے کہا " آہا ! مجھے پانچ پینس مل گئے۔ " اور مجھے " بیس پینس " ! جم چلایا " جینی کو کیا ملا ۔ ؟ " " ابھی بتاتی ہوں۔ " جب جینی نے اپنا خزانہ ڈھونڈنے کے لئے چمچ ادھر ادھر ملا تو اس کا پیارا انگشتانہ اوپر آ گیا۔ جینی بہت حیران ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کے والدین بھی حیران تھے کہ یہ پڈنگ میں کیسے گیا؟ جینی بھاگتی ہوئی باورچن کے پاس گئی اور اس سے اس بارے میں پوچھا۔ مگر اسے کچھ معلوم نہ تھا کیوں کہ ٹومی نے ہی تو آخر باورچن سے چھپ کر انگشتانہ پڈنگ میں ڈالا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ٹومی کائیں کائیں کرتا ہوا کھڑکی میں آ بیٹھا۔ جینی نے سوچا کہ شاید اس نے میرا انگشتانہ اٹھا لیا ہو اور چھپانے کے لئے پڈنگ میں پھینک دیا ہو۔ جب جینی نے ٹومی سے پوچھا تو اسے نے جواب دیا میں صرف کائیں کائیں کر دیا۔ اور جینی سمجھ گئی کہ اس کا مطلب ہاں ہے یا نہیں۔ بہرحال اس نے ٹومی کو کچھ نہ کہا کیوں کہ اسے اس کا پیارا انگشتانہ واپس مل چکا تھا۔ یہ کرسمس جینی کے لئے بہت ہی دلچسپ تھا۔

اقوالِ زرّیں

مرسلہ۔ محمد سعید آفتاب ...... نواب شاہ

۱ ...... جس کا حسنِ اخلاق اچھا ہو وہ کبھی بھی تنہا نہیں رہتا۔

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں
اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں

نقل شدہ، طویل اور
غیر معیاری تحریریں شائع
نہ ہوسکیں گی

اپنی نگارشات
صاف خوشخط کاغذ کے ایک
جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں

۲ ...... دنیا میں صرف وہی لوگ عزت پاتے ہیں جو استاد کی عزت کرتے ہیں۔

۳ ...... مصائب سے مت گھبراؤ کیونکہ ستارے اندھیرے میں چمکتے ہیں۔

۴ ...... انسان سے محبت کرنا ہی دراصل خدا سے محبت کرنا ہے۔

۵ ...... خاموشی انسان کے وقار کو بڑھادیتی ہے۔

۶ ...... گناہوں سے توبہ کرنے والا بے گناہ ہو جاتا ہے۔

۷ ...... نیکی کر کے جتلانا نیکی برباد کرنا ہے۔

اسلامی معلومات

مرسلہ۔ نبیل احمد

۱۔ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک انڈونیشیا ہے۔

۲۔ کویت اور افغانستان اسلامی دنیا کے ایسے دو ملک ہیں جہاں کوئی دریا نہیں۔

۳۔ سندر بن دنیا بھر میں مشہور جنگل ہے جو کہ اسلامی ملک بنگلہ دیش میں واقع ہے۔

۴۔ ترکی مملکت اسلامیہ کا وہ ملک ہے جو ایشیا اور یورپ دونوں براعظموں میں واقع ہے۔

۵۔ مصر کی کرنسی مصری پونڈ ہے۔

حیوانات

۱۔ "مار موسٹ" نامی بندر کی ایک قسم گلہری جتنی جسامت رکھتی ہے۔

۲۔ آسٹریلیا وہ واحد ملک ہے جہاں ریچھ نہیں پایا جاتا۔

۳۔ تمام جانوروں میں ہاتھی سب سے کم سوتا ہے۔

معائنہ

سید واصف اسلم ...... نواب شاہ

ایک دن انسپکٹر صاحب اچانک اسکول کے معائنہ کے لئے آپہنچے سب سے پہلے انہوں نے پہلی کلاس میں قدم رکھا۔ حساب کا سبق چل رہا تھا۔

"ذرا بتایئے تو آپ کی کلاس میں تیز لڑکے کون

ہیں؟"

"میں ان سے حساب کے سوال حل کراؤ نگا۔" انہوں نے ماسٹر صاحب سے کہا۔ مگر ماسٹر صاحب خاموش رہے۔ اور انہوں نے لڑکوں کو اشارہ کیا۔

"دھیرے سے ایک لڑکا اٹھا اور بورڈ کے پاس پہنچا۔ انسپکٹر صاحب نے جو سوال پوچھا۔ اس نے جھٹ پٹ بورڈ پر حل کر دیا۔ دوسرا لڑکا اٹھا اس نے بھی بورڈ پر سوال حل کر ڈالا۔ مگر تیسری بار جو لڑکا اٹھا وہ جھجھکتا ہوا بورڈ کی طرف بڑھا۔ بورڈ کے پاس جاکر چاک اٹھایا اور سوال حل کرنے ہی والا تھا کہ انسپکٹر صاحب پہچان گئے کہ یہ تو وہی لڑکا ہے جو پہلی بار آیا تھا۔

"یہ کیا تماشا ہے تم پہلی بار سوال حل کر کے جا چکے ہو نہ۔"

لڑکا جھنپتا ہوا بولا "معاف کیجئے انسپکٹر صاحب" میں ایک لڑکے کی جگہ آیا ہوں "ایک اور لڑکے کی جگہ پر کیا مطلب؟" انسپکٹر صاحب گرج اٹھے۔ "ایک لڑکا دوسرے کی جگہ امتحان دے یہ بات میں نے نہیں سنی۔"

لڑکا سانس روکے کھڑا تھا۔ ساری کلاس خاموش تھی کہ نہ جانے انسپکٹر صاحب کونسی سزا دیں۔

"تم کس کی جگہ پر آئے ہو؟" انسپکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی! وہ میں اپنے ایک دوست کی جگہ پر فٹ بال کا میچ دیکھنے گیا ہے۔" اتنا سننا تھا کہ انسپکٹر صاحب صاحب ماسٹر صاحب کی طرف مڑے اور بولے "اور آپ ماسٹر صاحب! آپ جانتے بھی ہیں کہ یہ لڑکا پہلے بھی سوال حل کر چکا ہے پھر بھی آپ مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں۔" ماسٹر صاحب جھجھکتے ہوئے "بات دراصل یہ ہے کہ میں ان لڑکوں کو نہیں پہچانتا"

"کیا! ان کے استاد ہو کر ان کو نہیں پہچانتے؟"

"جی ہاں! میں اس کلاس کو نہیں پڑھاتا۔"

"پھر آپ میاں کھڑے کیا کر رہے ہیں" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں دوسرے ماسٹر کے بدلے آیا ہوں وہ بھی فٹ بال دیکھنے گئے ہیں۔" اتنا سنتے ہی انسپکٹر صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے۔ "شکر ادا کریں ماسٹر صاحب! کہ میں بھی اپنے ایک دوسرے ساتھی انسپکٹر کی جگہ معائنے کے لئے چلا آیا ہوں۔ وہ بھی فٹ بال کا میچ دیکھنے گئے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ انسپکٹر صاحب کلاس سے باہر نکل گئے۔

انسانیت

محمد انجم مبین۔۔ ڈی آئی خان

انسان اپنی اہمیت اور زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے

مختلف پیشے اختیار کرتا ہے لیکن کچھ پیشے اتنے مقدس ہوتے ہیں کہ انسانیت ان کی ممنون احسان ہوتی ہے اور ایسے پیشوں میں جب مالی مفاد حد سے بڑھ جائے تو عوام پر برے دن آجاتے ہیں۔ اور ان پیشوں کا تقدس مجروح ہوجاتا ہے ڈاکٹر کو عام طور پر مسیحا کہا جاتا ہے لیکن موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی عام روش کو دیکھ کر ان کو مسیحا کہنا انسان کی توہین ہے۔

ڈاکٹر سے متعلق ایک پرانا واقعہ آج بھی میری آنکھوں میں پھرتا۔۔۔ رہتا ہے۔ اور میرا ذہن مجھ سے سوال کرتا رہتا ہے کہ ایسا کب تک ہوتا رہے گا اور کب ہر شخص اپنا فرض پہچانے گا۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک روز اسکول سے گھر آرہا تھا کہ اچانک ایک چیخ بلند ہوئی میں نے جو پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک کار والے نے اسکول کے بچے کو ٹکر ماری دی اور موقع سے فرار ہوگیا ہے۔ بہت سارے لوگ جمع ہوگئے ہیں میں بھی انسانی ہمدردی کے تحت کھڑا ہوگیا لڑکا غالباً چھٹی ساتویں میں پڑھتا ہوگا۔ اور اس وقت خون اُس کے سر سے تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ مجھے کار والے کی ستم ظریفی پر بہت غصہ آیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ قصور کار والے کا تھا یا اس بچے کا۔ مگر کار والے نے فرار ہو کر اپنی غلطی کا ثبوت دے دیا تھا۔ خیر کچھ لوگ بچے کو اٹھا کر قریبی پرائیویٹ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے بچے کے سر پر شدید چوٹ لگی تھی اگرچہ ہم نے اس کے سر پر کپڑا باندھ دیا تھا مگر خون رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

ایمرجنسی وارڈ کے بینچ پر زخمی بچے کو لٹانے کے بعد ہسپتال کے عملے سے رابطہ کیا تو انھوں نے کہا کہ بچے کا کوئی وارث ہے؟

ہم نے عرض کیا کہ جناب ہم سب راہ گیر ہیں او حادثے کے عینی گواہ ہیں بچہ کا خون ضائع ہو رہا ہے۔ براہ کرم فوراً اس کے علاج پر توجہ دیں۔ مگر انتہائی لاپرواہی سے کہا گیا کہ یہ پولیس کیس ہے جب تک پولیس نہیں آئے گی ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ لوگوں نے جب پولیس کا نام سنا تو کھسکنے لگے صرف چند لوگ وہاں رہ گئے نجانے کیوں پولیس کا نام سنتے ہی لوگوں کی انسانیت غائب ہوگئی تھی۔

پھر کسی اللہ کے بندے نے ہمت کر کے پولیس کو فون کر دیا اور حادثے کی تفصیلات پولیس کو دے دیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب پولیس ہسپتال پہنچی تو وہ زخمی بچہ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہوچکا تھا۔

پولیس کے آنے سے قبل میں نے بڑی عاجزی سے موقع پر موجود ڈاکٹر سے استدعا کی لیکن میری گذارش پر صرف اس لئے نہیں کان دھرا گیا کہ میں وارث نہ تھا اور اس کے وارث بروقت اس لئے نہ پہنچ سکے کیونکہ وہ بچہ دیہات کا رہنے والا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر کے اردلی کی زبانی معلوم ہوا کہ مریض کا وارث ہوتا تو صاحب بات چیت کرتے۔ کیونکہ بات چیت کی قیمت ۲۵۰ روپے تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب یہ بات چیت راہ گیروں سے تو نہ کرسکتے تھے۔ اسی لئے ایک قیمتی جان ڈاکٹر صاحب کی بے جا فیس کی بھینٹ چڑھ گئی۔

تین گناہ ایسے ہیں جن کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی ایک شرک۔ دوسرے والدین کی حق تلفی۔ تیسرے میدانِ قتال فی سبیل اللہ سے فرار۔

مرسلہ ...... عامر راولپنڈی

لوری (نظم)

محمد افضل سراج گوجرانوالہ

سارے جہاں سے پیارا تو ہے — میری آنکھ کا تارا تو ہے
خوشیوں کا گہوارہ تو ہے — میرے دل کا سہارا تو ہے
سوجا میرے چندا سوجا
نیند کی وادی میں تو کھوجا

جگ میں ایسے کام کرے تو — روشن حق کا نام کرے تو
نفرت کو گمنام کرے تو — ہر جا الفت عام کرے تو
سوجا میرے چندا سوجا
نیند کی وادی میں تو کھوجا

علم کی مشعل لے کر چلنا — جگ سے دور اندھیرا کرنا
غیر کے آگے کبھی نہ جھکنا — اس کے لئے ہو چاہے مرنا
سوجا میرے چندا سوجا
نیند کی وادی میں تو کھوجا

تیری بدولت قوم کی عزّت — شوکت، عظمت، رفعت، شہرت
قرباں تجھ پہ ساری دولت — رب کی سدا ہو تجھ پہ رحمت
سوجا میرے چندا سوجا
نیند کی وادی میں تو کھوجا

دور رہیں سب تجھ سے اندھیرے — دل میں خوشیوں کے ہوں ڈیرے
قسمت میں ہوں نئے سویرے — ماں کی دعائیں ساتھ ہیں تیرے
سوجا میرے چندا سوجا
نیند کی وادی میں تو کھوجا

روشن مثال

The Pick of The month

ان ساتھیوں کا تعارف
جنہوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

اظہر کریم۔
۱۵ سال ۵ ماہ، دسویں۔
مشاغل، اسکاؤٹنگ، معلومات عامہ
کرکٹ۔
پسندیدہ مضمون، فزکس۔
اہم کامیابی، نویں میں اے گریڈ۔
اسکاؤٹنگ میں متعدد انعامات۔
الجیلانی منزل ڈھولف آباد میرپور خاص

تاج محمود عباسی،
۱۶ سال، گیارہویں،
مشاغل، معلوماتی کتب پڑھنا۔
پسندیدہ مضمون، انگلش،
اہم کامیابی، میٹرک میں "بی" گریڈ۔
نیو عباسی محلہ وارڈ نمبر ۴
ٹھٹھہ (سندھ)

سیّد سعد وسیم۔
۱۵ سال ۴ ماہ ، نویں۔
مشاغل، کرکٹ کھیلنا۔
پسندیدہ مضمون، انگلش۔
اہم کامیابی، کراچی انڈر ۱۹ میں
بہترین بیٹنگ۔
۴، بی ۲/۴ ۔ ناظم آباد، کراچی۔

فیاض احمد۔
۱۴ سال، ہشتم۔
مشاغل، آنکھ مچولی پڑھنا، سیر کرنا۔
پسندیدہ مضمون، حساب۔
اہم کامیابی، چھٹی، ساتویں میں
اوّل پوزیشن۔
منور احمد۔ ایس ایچ۔ او پولیس
کیمپ نمبر ۲، نواب شاہ۔

مصدق عنایت۔
بارہ سال چھ ماہ، نہم۔
مشاغل، کرکٹ کھیلنا، ٹکٹ اور سکّے
جمع کرنا۔ پسندیدہ مضمون، سائنس۔
اہم کامیابی، مسلسل دو سال انگلش
تقریر میں ضلع میں اوّل۔
محلّہ شاد باغ لالہ موسیٰ، گجرات۔

رخشندہ ریاض۔
۱۸ سال، ایف ایس سی۔
مشاغل، مطالعہ، خانہ داری۔
پسندیدہ مضمون، بیالوجی۔ کیمیا۔
اہم کامیابی، میٹرک میں [illegible] نمبر
اسکول میں تیسری پوزیشن، بیالوجی
۹۲/۱۰۰ نمبر کیمیا ۸۶/۱۰۰ نمبر۔
لاہور۔

آپ کی تصویر اس فریم
کے سائز میں کٹی ہونی چاہیئے
چھوٹی یا بڑی تصویر
قابلِ قبول نہ ہوگی

مجسٹریٹ! کیا واقعی تم نے ایک ہفتے میں چھ دن چوری کی ہے؟

ملزم۔ جی ہاں! اور مجھے یقین ہے کہ اگر ہم میں سے ہر شخص اسی طرح محنت اور جان فشانی سے کام کرے تو ہمارا ملک دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر سکتا ہے۔

نسیم انور فیصل آباد

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جا بجا کوپن پھاڑنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام ---------- کلاس ---------- عمر ----------

ارسال کردہ کل رقم ---------- بذریعہ ---------- دستخط ----------

پتا --

روشن مثال میں شرکت کا کوپن

نام ---------- عمر ---------- جماعت ----------

مشاغل ---------- پسندیدہ مضمون ----------

کوئی اہم کامیابی ----------

پتہ --

اچھی کتابیں

سرمایۂ حیات بھی رفیقِ زندگی بھی

طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ﷺ۔ سیرت طیبہ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجازِ مقدس کا سفرنامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
٦ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا:۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱٦۔

کیا آپ نے بھی کوئی روشن مثال قائم کی ہے؟

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، کوئی اور کارنامہ......

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہوسکے گا۔

○ ...... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہوسکے گی۔

یاد رہے! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو (BESTOFMONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء و طالبات اس میں شریک ہوسکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر ۱۳۵ پر موجود ہے۔

امی ابو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ہما سلیم

قرآن کریم وہ آسمانی صحیفہ اور مقدس کتاب ہے جس کا پڑھنا اور سمجھنا ہم سب پر فرض ہے، قرآن پاک ہمارے عقائد کی بنیاد اور ہماری تعلیمات کا سرچشمہ ہے، وہ شخص بد بخت ہے جو قرآن مجید نہ پڑھ سکا، یا جس نے اسے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

مسلمان گھرانوں میں بچوں کو ابتدائی عمر میں قرآن کی تعلیم دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی بچہ اسکول میں جا کر جدید علوم نہ پڑھ سکے مگر قرآن پاک کا پڑھنا اور سیکھنا ہم سب اپنے لئے جزو ایمان سمجھتے ہیں اور غریب گھرانہ ہو یا امیر، تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ، سبھی مسلمان اپنے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کا اہتمام ضرور کرتے ہیں۔

احکام خداوندی پر مبنی رشد و ہدایت کی اس کتاب کو ایک طرف جہاں پڑھنا، پڑھانا، جاننا اور سمجھنا انتہائی ضروری ہے وہیں اس کو پڑھنے میں بعض احتیاطیں بھی بہت ناگزیر ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی یا معمولی سی لغزش گناہ گار بھی کر سکتی ہے اور مفہوم و معنی کو بھی بدل سکتی ہے۔

ہمارے ہاں شہروں اور دیہاتوں میں یہ بات عام ہے کہ بچے یا تو گھر میں قرآن شریف پڑھتے ہیں یا پھر قرآن پاک کی تعلیم کے لئے انہیں کسی مدرسے وغیرہ میں بھجوا دیا جاتا ہے یا پھر کوئی مولوی صاحب گھر پہ آکر پڑھا جاتے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں تشویش کا ایک پہلو یہ ہے کہ اکثر والدین یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ، جو شخص بھی بچوں کو قرآن شریف پڑھا رہا ہے وہ خود اس ذمہ داری کا متحمل بھی ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ اسے قرآن، کے متن کو صحیح لب و لہجے اور ٹھیک ٹھاک تلفظ کے ساتھ خود بھی پڑھنا آتا ہے یا نہیں؟ مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر گھروں میں خالہ، ماسی، نانی، دادی یا کوئی اور شخص بچوں کو پڑھاتا رہتا ہے۔ بچے اور ان کے والدین بھی مطمئن رہتے ہیں کہ بچہ پڑھ رہا ہے مگر حقیقتاً وہ چھوٹی عمر میں قرآن کو غلط طریقے سے پڑھنا سیکھ لیتا ہے اس کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بچہ بڑا ہو کر آسانی سے اپنے تلفظ اور لب و لہجے کی اصلاح نہیں کر پاتا۔ بچپن کا سبق مشکل ہی سے محو ہوتا ہے۔

اس مسئلے کو معمولی نہ جاننے اور اپنے بچے کے معلم کو اس کی صلاحیتوں اور اس کے علم کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ قرآن پاک کی بہتر تعلیم کی خاطر یہ جستجو مفید بھی ہوگی اور کار ثواب بھی۔

بروک

پکوڑا مِکس

لذت بھی، سہولت بھی

سادہ پکوڑے، پیاز، آلو، پالک کے
پکوڑے اور مزے دار دہی پھلکیاں، ان
تمام چٹپٹی چیزوں کے لئے بروک پکوڑا مکس کا
جواب نہیں۔ بروک پکوڑا مکس ہمیشہ گھر میں رکھیے۔

بروک بانڈ پاکستان لمیٹڈ

manhattan/BBDO

REGD. No. M-266 APRIL 1991

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI